بلتی زبان وادب پر اردو کے اثرات: ایک تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)

مقالہ نگار

ولایت علی منتظری

نگران

پروفیسر سید محمد انوار عالم (انور پاشا)

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

۲۰۱۹ء

Dated: 19 /07 /2019

Declaration

I hereby declare that the ~~M.Phi~~l. ~~Dissertation~~ / Ph.D. thesis entitled "BALTI ZUBAN WA ADB PAR URDU KE ASRAAT: EK TAJZIYATI MUTALA'' [INFLUENCES OF URDU ON BALTI LANGUAGE AND LITERATURE: AN ANALYTICAL STUDY] submitted by me is the original research work. It has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution to the best of my knowledge.

I further declare that no plagiarism has been committed in my work. If anything is found plagiarised in my Thesis/ D~~issertation~~, I will be solely responsible for the act.

Sign of Research Scholar

WILAYAT ALI

Name of Research Scholar

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 19 /07 /2019

Certificate

This is to certify that the Mr. / ~~Ms~~. Wilayat Ali, a bona-fide Research Scholar of Centre of Indian Languages, SLL&CS has fulfilled all the requirements as per the University Ordinance for the submission of ~~M.Phil~~. ~~Dissertation~~/Ph.D. thesis entitled"BALTI ZUBAN WA ADB PAR URDU KE ASRAAT: EK TAJZIYATI MUTALA'' [INFLUENCES OF URDU ON BALTI LANGUAGE AND LITERATURE:AN ANALYTICAL STUDY]

This may be placed before the examiners for evaluation for the award of the degree of ~~M.Phil~~./Ph.D.

Name: PROF.S.M ANWAR ALAM (ANWAR PASHA)

(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Name: PROF.OMPARKASH SINGH

(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

انتساب

شفیق اساتذہ کرام، والدین اور دوستوں کے نام

جن کی شفقت و محبت سے اس مقالہ کو لکھنے کا حوصلہ ملا۔

ولایت علی منتظری

فہرست

پیش لفظ (1)

باب اول: مختصر تاریخ لداخ وبلتستان (11)

باب دوم: بلتی زبان کی ابتداوارتقاء (34)

باب سوم: خطہ لداخ وبلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات (59)

باب چہارم: بلتی زبان کے معروف شعراء کی تخلیقات اوران پر اردو کے اثرات (84)

باب پنجم: (حصہ اول) بلتی زبان کے معروف نثر نگاروں کی تخلیقات اوران پر اردو کے اثرات (146)

(حصہ دوم) بلتی کہاوتوں پر اردو کے اثرات (169)

حاصل مطالعہ (192)

کتابیات (200)

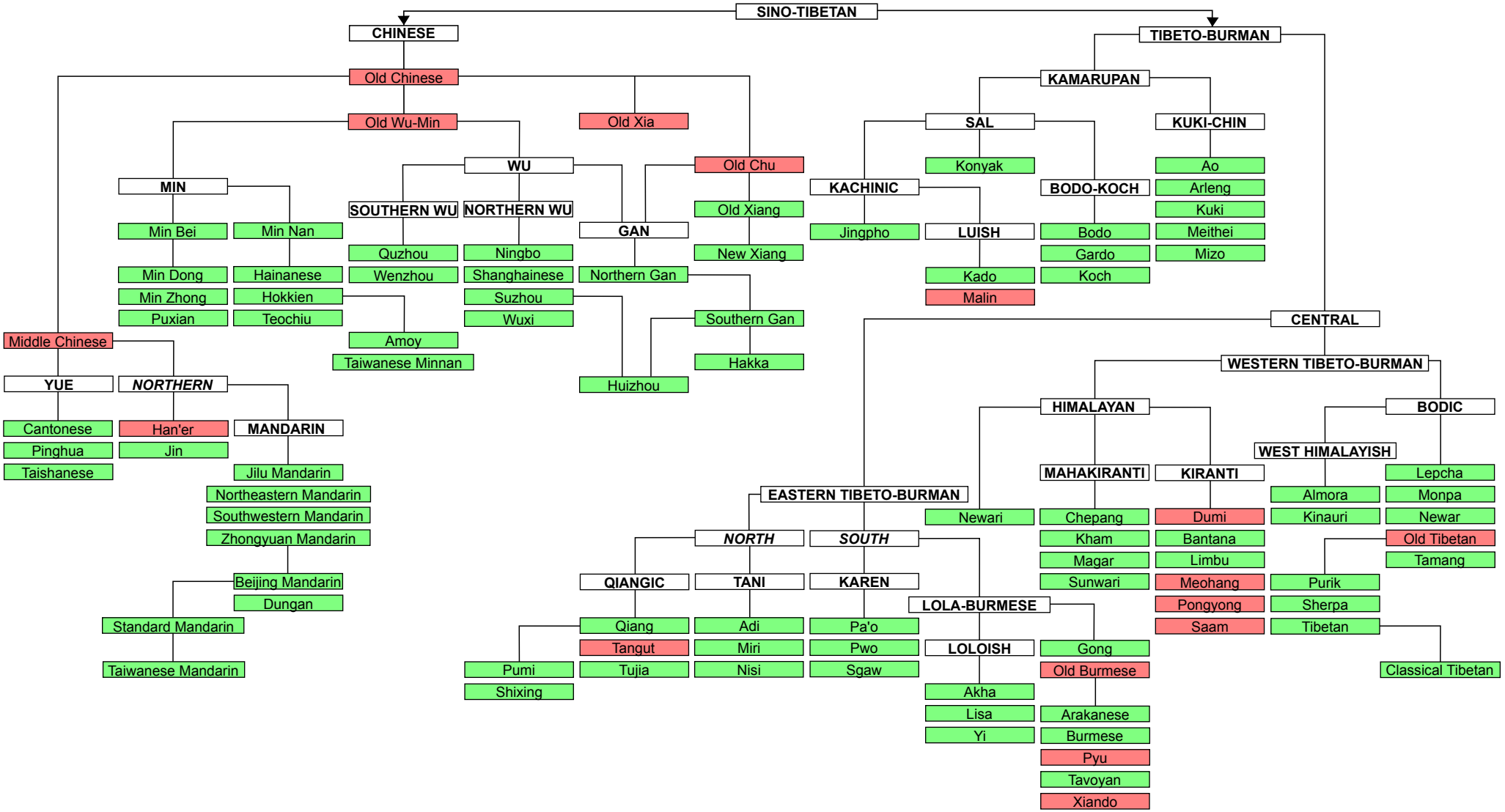

SINO-TIBETAN
CHINESE
Old Chinese
Old Wu-Min
Old Xia
MIN
Min Bei
Min Nan
Min Dong
Min Zhong
Puxian
Hainanese
Hokkien
Teochiu
Amoy
Taiwanese Minnan
WU
SOUTHERN WU
NORTHERN WU
Quzhou
Wenzhou
Ningbo
Shanghainese
Suzhou
Wuxi
Old Chu
Old Xiang
New Xiang
GAN
Northern Gan
Southern Gan
Hakka
Huizhou
Middle Chinese
YUE
NORTHERN
Cantonese
Pinghua
Taishanese
Han'er
Jin
MANDARIN
Jilu Mandarin
Northeastern Mandarin
Southwestern Mandarin
Zhongyuan Mandarin
Beijing Mandarin
Dungan
Standard Mandarin
Taiwanese Mandarin
TIBETO-BURMAN
KAMARUPAN
SAL
KUKI-CHIN
Konyak
KACHINIC
Jingpho
LUISH
Kado
Malin
BODO-KOCH
Bodo
Gardo
Koch
Ao
Arleng
Kuki
Meithei
Mizo
CENTRAL
WESTERN TIBETO-BURMAN
HIMALAYAN
Newari
MAHAKIRANTI
Chepang
Kham
Magar
Sunwari
KIRANTI
Dumi
Bantana
Limbu
Meohang
Pongyong
Saam
BODIC
WEST HIMALAYISH
Almora
Kinauri
Lepcha
Monpa
Newar
Old Tibetan
Tamang
Purik
Sherpa
Tibetan
Classical Tibetan
EASTERN TIBETO-BURMAN
NORTH
SOUTH
QIANGIC
Qiang
Tangut
Tujia
Pumi
Shixing
TANI
Adi
Miri
Nisi
KAREN
Pa'o
Pwo
Sgaw
LOLA-BURMESE
LOLOISH
Akha
Lisa
Yi
Gong
Old Burmese
Arakanese
Burmese
Pyu
Tavoyan
Xiando

پیش لفظ

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان کی حیثیت ایک لینگوا فرینکا زبان کی رہی ہے اور اس میں مختلف علوم کے ادبیات موجود ہیں۔اس کا ادبی سرمایہ بھی کافی وقیع ہے۔اردو کی لسانی اہمیت اور اس کے پرثروت ادبی سرمائے کے سبب اس کے اثرات برصغیر کی دوسری زبانوں پر بھی مرتب ہوئے۔ ہندوستان کی جن زبانوں نے اردو زبان وادب سے اثرات قبول کیے ان میں ایک بلتی زبان بھی ہے جو کہ لداخ و بلتستان میں بولی جاتی ہے۔خطہ لداخ و بلتستان جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے ملک کے دوسرے خطوں کے مقابلے کافی مختلف ہے۔لیکن بدلتے زمانے اور حالات کے تغیر کی وجہ سے برصغیر میں مختلف النوع تبدیلیاں رونما ہوئیں اور یہاں بھی تہذیبی اور لسانی سطح پر بدلاؤ آیا۔خاص کر چودھویں صدی میں بالخصوص بلتستان اور بالعموم خطہ لداخ مبلغین اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔اس سے زندگی کی ہر شعبے میں تبدیلی آئی۔زبان وادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے اور اس میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

بلتی زبان کی لسانی شاخ سائنو تبتیں سے ملتی ہے۔بلتی زبان ہندوستان اور پاکستان کے کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔خطۂ بلتستان کی مناسبت سے اسے بلتی زبان کہا جاتا ہے۔حالانکہ یہ زبان لداخ اور بلتستان دونوں علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لداخ اور بلتستان میں بلتی زبان کے علاوہ شینا، پرگی اور لداخی وغیرہ بھی بولی جاتی ہے لیکن شینا زبان کی شاخ بلتی سے نہیں ملتی بلکہ اس زبان کا تعلق ہند آریائی زبانوں کی شاخ سے ہے۔بلتی، پرگی اور لداخی تینوں زبانوں کا تعلق سائنو تبتین سے ہے اس حوالے سے عبدالغنی شیخ نے معروف محقق سنیوگتا کوشل حوالہ دے کر لکھا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

''بول چال لداخی کا ماخذ تبّتی زبان ہے اور یہ چینی خاندان کی زبانوں کے چین تبت گروپ سے تعلق رکھتی ہے''۔۱

شیخ صاحب مزید لکھتے ہیں:

ڈاکٹر سنیوگتا کوشل نے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے زیر اہتمام ۱۹۷۰ء کی دہائی میں قبائلی اور سرحدی علاقوں کی زبانیں سیکھنے کے پروگرام کے تحت عام بول چال کی لداخی زبان پر ریسرچ کیا اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔تاہم کئی یورپی محققوں کا خیال ہے کہ بول چال کی لداخی تبّتی زبان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہ اس خطے میں تبتیوں کی آمد سے بہت پہلے مروج تھی۔۲

۱،۲۔شیخ،عبدالغنی؛لداخ: تہذیب وثقافت، کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، ۲۶۷، جوگی گیٹ، جموں (۲۰۰۵۱۸۰۰۰۱)،ص: ۳۱۷

جب لداخی بول چال کی زبان کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو اس کا اطلاق بلتی پر بھی ہوتا ہے۔ بلتی، لداخی اور پورگی کا رسم الخط پہلے ایک ہی تھا لیکن بلتی (پرگی) نے لگ بھگ پانچ سو سال پہلے فارسی یا اردو رسم الخط اختیار کر لیا اور اسی رسم الخط میں ہزاروں کتابیں اور بیاضیں لکھی گئیں۔

پرانے رسم الخط کو ایک تبّتی عالم تھونمی سمبھوٹا نے ساتویں صدی میں سنسکرت دیوناگری رسم الخط سے اخذ کیا تھا۔ انہوں نے تبّتی ماحول اور زبان کے مزاج اور ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم کی اور نئے حروف کو بھی شامل کیا۔ تھونمی سمبھوٹا کو تبت کے حکمران رونگ ژنگیاپو (۶۱۷۔۶۵۰) نے ایک ٹیم کے ہمراہ تبّتی زبان کے لئے ایک رسم الخط کی تلاش میں ہندوستان بھیجا تھا۔

بلتستان پاکستان کے زیرانتظام کشمیر کا ایک صوبہ ہے جس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ لداخ کی آبادی تین لاکھ ہے جبکہ بلتی بولنے والوں کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ لاکھ اور لداخی بولنے والے تقریباً پونے دو لاکھ ہیں۔ بلتستان کے باشندوں کو بھی بلتی کہا جاتا ہے۔ بلتی اور لداخی ایک زبان ہونے کے باوجود بھی گزشتہ صدیوں کے دوران ان میں تغیر و تبدل ہوتا چلا آرہا ہے۔ ساتویں صدی کے درمیان دونوں حصے تبت کے زیرنگرانی تھے تب دونوں خطوں میں تبّتی دیوناگری رسم الخط مروج تھا جسے اِیگے کہا جاتا ہے۔

چودھویں صدی میں جید عالم دین میر سید علی ہمدانی بلتستان اور لداخ میں وارد ہوئے اور انہوں نے اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ ان کے بعد کئی مبلغین آئے جو اپنے ساتھ عربی اور فارسی زبانیں لائے۔ سولہویں صدی میں ایک بلتی شہزادی گل خاتون کی شادی مغل شہزادہ ولی عہد جہانگیر سے ہوئی۔ مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اس لیے براہِ راست فارسی اور عربی کا اثر بلتی زبان پر پڑا اور بلتی میں فارسی اور عربی کے متعدد الفاظ داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ بلتیوں نے فارسی رسم الخط کو اختیار کر لیا۔ بلتی زبان پر اردو زبان کے اثرات کے حوالے سے محمد حسن حسرتؔ لکھتے ہیں:

> ''بلتی زبان کا اردو کے لسانی خاندان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہاں کے لوگ دنیا سے منقطع ہونے کے باعث چھ سو سال تک ہند آریائی، ہند ایرانی اور عربی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ بلتی پر اردو کا اثر بلاواسطہ اور بالواسطہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۴۰ء کے بعد بلتستان جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ کے زیرتسلط آیا۔ مہاراجہ کو بلتستان میں نظم و نسق چلانے کے لیے ملازمین کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت بلتستان کے ناخواندہ معاشرے سے فوراً پوری کرنا محال تھا۔ اس کے لیے کشمیر، جموں اور شمالی ہند سے ملازمین لانے پڑے جہاں

تعلیم مقابلتاً پہلے ہی عام ہوچکی تھی اور ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ چنانچہ بلتستان میں جب اسکول کھلے اور لوگوں نے آہستہ آہستہ تعلیم کی جانب توجہ دینا شروع کی تو ذریعہ تعلیم اردو ہی کو قرار دیا گیا جو لوگ تعلیم حاصل کر لیتے وہ مہاراجہ سرکار کے ملازم ہوجاتے۔ اس طرح اردو خود بخود بلتستان کی سرکاری زبان بنتی چلی گئی۔''[1]

۱۸۳۶ء میں جموں کی ڈوگرہ حکومت نے لداخ کو اور ۱۸۴۰ء میں بلتستان کو اپنے زیر قبضہ لے لیا۔ ڈوگروں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو ریاست جموں کی سرکاری زبان بنادی اور پھر بعد میں اسے ذریعہ تعلیم بھی بنایا گیا۔ سرکاری زبان بننے سے پہلے بھی اردو بلتستان اور لداخ میں تبادلہ خیال کے لئے رابطے کی زبان تھی۔ فارسی ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود بھی اس کا استعمال اعلیٰ طبقہ تک محدود تھا۔ آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق عام لوگوں کے لئے دفاتر میں اردو اور انگریزی کا استعمال ہوتا تھا اس کی وجہ سے اردو کو سرکاری زبان بننے میں آسانی ہوئی۔ بلتی کی طرح لداخی میں بھی فارسی اور اردو کے متعدد الفاظ اپنی اصلی یا بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ لداخی میں گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران اردو، فارسی اور انگریزی الفاظ کی جگہ متبادل الفاظ اور اصطلاحات نے لے لی ہیں جن کا ماخذ تبتی ہے۔ تبتی الفاظ لداخی زبان میں بڑی آسانی سے گھل مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لداخی زبان میں موجود الفاظ کے استعمال کی مہم بھی چلائی گئی۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ یہ نتیجہ نکلا کہ حالیہ سالوں میں لداخی زبان دانوں اور دانشوروں نے لداخی زبان کو غیر لداخی الفاظ سے پاک کرنے کے لئے قدرے غلو سے کام لیا۔ حتیٰ کہ ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی فون اور فلموں میں بھی اس کے الفاظ اور جدید سائنسی ایجادات کے لئے متبادل لداخی الفاظ وضع کئے گئے۔ گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران لداخی میں اردو، فارسی اور عربی سمیت کئی اور زبانوں کے الفاظ اصلی یا بگڑی صورت میں مدغم ہوئے ہیں۔ جن کو عام لوگ روزمرہ کی بات چیت میں استعمال کرتے ہیں۔ تاہم عمومی طور پر اکثر لوگ لداخی زبان استعمال کرنے لگے ہیں۔ جس کو سماجی طور قبولیت حاصل ہوئی ہے جو بلتیوں کے لئے اجنبی بنی ہے۔ اس کے برعکس بلتی بولنے والے اپنی تحریر، تقریر اور روزمرہ کی بات چیت میں فارسی، عربی اور اردو کے الفاظ بے کم و کاست استعمال کرتے ہیں۔ جو پچھلی کئی صدیوں کے دوران بتدریج بلتی زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ بلتی مورخ اور ادیب محمد یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں:

''صدیوں سے بلتی زبان کے لئے فارسی رسم الخط رائج ہونے کی وجہ سے بلتی ادب کا سارا ذخیرہ اس رسم الخط میں موجود ہے اور

۱۔ حسرتؔ، محمد حسن؛ بلتستان تہذیب وثقافت، جدید ایڈیشن، بلتستان بک ڈپو، نیا بازار سکردو، ۲۰۰۷ء، ص: ۹۷

اس سے دامن چھڑانا بلتی کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔۱

ایک اور بلتی مصنف راجا محمد علی شاہ صبا نے اپنی تاریخی کتاب ،نقیب آزادی،، میں لکھتے ہیں:

'بلتستان میں طلوع اسلام کے بعد عربی اور فارسی کے اثرات اس قدر تیزی سے نفوذ پذیر ہوئے کہ تبتی زبان' ایگے' ایک دم متروک ہوگئی۔''۔۲

عام بلتیوں کے مزاج اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلتی کے لئے اردو یا فارسی رسم الخط قائم ودائم رہے گا۔اگر چہ بلتستان کی راجدھانی سکردو اور کرگل میں چند دانشور بلتی ادیبوں کی خواہش ہے کہ پرانا رسم الخط بحال کیا جائے۔بلتی پرانے ایگے (رسم الخط) میں صوتی لحاظ سے چند ایسے حروف ہیں جن کے متبادل حروف اردو یا فارسی میں نہیں ہیں۔اس سلسلے میں اردو کے چند حروف تہجی پر اعراب ڈال کر متبادل حروف وضع کئے گئے ہیں جو صوتی کمی کو پورا کرتے ہیں۔اس کا سہرا محمد یوسف حسین آبادی کے سر ہے۔انہوں نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں ادبی تنظیم حلقہ علم وادب سکردو کی میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی تھی جو معمولی ترمیم کے ساتھ منظور کی گئی بعد میں اسے قاعدہ کی صورت میں یہ شائع کیا گیا۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راجا محمد علی شاہ صباء نے لکھا ہے:

''چونکہ فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی بلتی زبان صحیح تلفظ کے ساتھ ممکن نہ تھی۔اس لئے بلتستان کے حلقہ علم و ادب جو قابل حد تحسین وآفرینش ہے،، کی ایما پر بلتستان کے مشہور دانشور اور ماہر تعلیم جناب محمد یوسف حسین آبادی کی زیر نگرانی چند اہل قلم حضرات نے بلتی زبان کے لئے حسب ضرورت چند حروف وضع کئے جس کی وجہ سے اب بلتی تحریروں کو اصلی تلفظ اور آوازوں کے ساتھ پڑھنا ممکن اور آسان ہوگیا ہے۔''۳

بلتی زبان میں پچاس حروف ہیں جن میں ۴۳ حروف مفرد اور ۷ حروف مرکب ہیں۔جموں وکشمیر کی حکومت نے بلتی اور لداخی زبانوں کو ریاست کی منظور شدہ زبانوں کے شیڈول میں شامل کیا ہے اور لیہہ اور کرگل قصبوں میں کلچرا کادمی کے دفاتر کھولے گئے ہیں اور ریاستی سرکار ہر سال بلتی اور لداخی زبان کی بہترین کتابوں کو ایوارڈ دیتی ہے۔بلتی تصنیف اردو رسم الخط میں قبول کی جاتی ہے۔جموں وکشمیر میں کشمیری، گوجری اور پہاڑی زبانوں کا رسم الخط بھی اردو ہے۔

اگر ہم ان دونوں زبانوں کا تجزیہ اور مطالعہ کریں تو ماہرین لسانیات میں یہ متفقہ رائے ہے کہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی زبان ہے۔پرگی سے مراد کرگل اور اسکے گردونواح میں بولی جانے والی زبان،اور بلتی سے مراد کرگل (لداخ) و

۱۔آبادی،محمد یوسف حسین؛تاریخ بلتستان بلتستان بکڈپو نیا بازار،سکردو،۲۰۰۳،ص:۳۲۱

۲۔صبا،راجہ محمد علی شاہ اماچا؛نقیب آزادی۔گیلانی پرنٹرز رابسن روڈ،کراچی،۱۹۹۸ء،ص:۲۳۱۔ (۳۔ایضاً،ص:۲۳۲)

بلتستان میں مروج و مستعمل زبان ہے لیکن ان دونوں زبانوں میں اتنی مماثلت ہے کہ یہ دونوں زبانیں کافی حد تک ایک جیسی لگتی ہیں۔ صادق علی صادقؔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ہر ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ بلتی اور پرگی زبان کا نہ صرف چولی دامن کا رشتہ ہے بلکہ اکثر مقامات پر یہ پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا یہ زبان بلتی ہے یا پرگی۔ بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جہاں سے بلتی زبان کا لشکر اپنی آپ وتاب کے ساتھ روانہ ہوجاتا ہے۔ وہاں سے ہی پرگی زبان کا کارواں اس میں مدغم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ بلتی بولنے والا پرگی اور پرگی بولنے والا بلتی با آسانی بول اور سمجھ سکتا ہے۔ بلتی اور پرگی کے ذخیرہ الفاظ، جملوں کی ساخت، لہجے، تلمیحات اور اشارات، طرز بیان اور فکر و احساسات مشترک ہیں بشرطیکہ لوگ پرگی کے الفاظ اور ان کے مخارج کو صحیح اور قدیم ڈھنگ سے استعمال کرے۔

بلتستان اور پریگ کے لوک روایات، لوک گیت، قصے کہانیاں، اور تہذیب وتمدن خواہ اشاعتِ اسلام سے پہلے کی ہو یا بعد کی سب کے سب مشترک ہیں،،ا۔

بلتی زبان میں باقاعدہ ادبی آغاز ۱۸۴۰ء میں ہوا۔ بلتی زبان نے متعدد شعرا پیدا کئے ہیں۔ ماضی میں بلتستان میں سرکردہ فارسی شعراء بھی گزرے ہیں جن میں میر نجم الدین ثاقب خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ فی زمانہ بہت سارے شعراء اردو اور بلتی دونوں زبانوں میں اپنا کلام لکھتے ہیں۔ چند بلتی شعراء اپنی اردو شاعری کی رعنائی اور غنائیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ شعر گوئی عام لوگوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ بلتستاں کے آخری راجا احمد شاہ کے چار بیٹے حسین علی خان محبؔ، لطف علی خان عاشقؔ، امیر حیدر مخلصؔ اور ملک حیدر بیدلؔ اچھے شاعر تھے۔ بقول ایک نقاد کہ انہوں نے ڈوگرہ حکومت کی قید و بند کے دوران غزل گوئی، قصیدہ گوئی، مرثیہ گوئی اور نوحہ خوانی کو عروج کمال تک پہنچایا۔ عاشق کے بیٹے محمد علی خان ذاکر نے بھی قصیدے اور مرثیے لکھے ہیں۔ شگر کے بلتی راجا حیدر خان حیدر اور ان کے بیٹے مراد خان مراد بھی شاعر تھے۔ مراد نے فارسی اور اردو میں بھی طبع ازمائی کی ہے حیدر کے کلام میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کے اشارات ہیں۔

بلتی زبان میں قرآن مجید اور انجیل کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع کے دوران ایک انگریز اے ایف سی ریڈ نے انگریزی میں بلتی زبان کی میں ترجمہ ہوا۔ بلتی اور لداخی میں بہت سی ضرب الامثال ہیں جن کا اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ فارسی۔ بلتی، اردو۔ بلتی اور انگریزی۔ بلتی لغات بھی چھپی ہیں۔ سید حسین موسوی امبہ کی مجمع لغات اور شیخ علی حلمی کی لغت ھدایۃ الطالب اطلی اللغہ اس ضمن میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

ا۔ جالبؔ، جواد امینی؛ مدحت، امینی پبلی کیشنز، ڈیتھنگ کرگل، جنوری ۲۰۱۵، ص:۳۲

بلتستان کے مقابلے میں لداخ میں بلتی زبان میں لکھنے والے بہت کم ملتے ہیں لداخ میں سب سے پہلے بلتی زبان میں لکھنے والوں میں، ضلع کرگل سے تعلق رکھنے والے آخوند محمد کاظم سنگرہ ہیں آخوند صاحب نے مراثی، نوحے اور قصیدے لکھے ہیں ۔اس کے بعد شیخ غلام فیاض نے نعت ومنقبت میں طبع آزمائی کی اس کے علاوہ اور بھی شعراء اور نثر نگار ہیں جن کا تذکر اس مختصر سے خاکے میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بلتی زبان میں بھی ادب کا آغاز شاعری سے ہی شروع ہوا ہے اس لئے بلتی میں نثری ادب کم اور شعری سرمایہ وافر مقدار میں ملتا ہے۔شاعری بہت زیادہ ہیں ۔وہ کتابیں جو نثر میں موجود ہیں ان میں اکثر کتابیں مذہبی نوعیت کی ہیں ۔آنے والے دنوں میں نثری ادب میں بھی اضافہ ہونے کا امکان ہے۔بلتی ایک جامع زبان ہے جس کا شعری سرمایہ بہت بڑا ہے۔بلتی میں حمد،نعت،منقبت،قصیدہ،مرثیہ،مناجات،نوحہ،مثنوی،رباعی ،قطعہ،شہر اشوب،گیت،غزل،ہجو،ملی نغمہ،قوالی اور زرعی نغمہ لکھا گیا ہے۔اوزان ،قوافی اور ردیف کا خیال رکھا جاتا ہے۔تشبیہ،استعارہ،کنایہ،رمز وغیرہ بلتی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔محمد یوسف حسین آبادی بلتی شاعری پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے بلتی قصیدے، مرثیے ،نوحے،ہجو عموماً اردو غزل کی صورت میں ہوتے ہیں۔جن کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے۔ہیئت اور ساخت کے علاوہ معنویت کے اعتبار سے بھی بلتی شاعری انتہائی ترقی کے منازل طے کر چکی ہے۔جس میں فصاحت و بلاغت کے سارے اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔''[۱]

بلتی ادیب صبا نے بھی لکھا ہے کہ بلتی زبان میں بے نظیر شہپارے اور لاجواب منظومات موجود ہیں۔سید محمد کاظمی نے متعدد بلتی لوک گیتوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ''بلتی لوک گیت'' کے نام سے کتاب شائع کی ہے۔سینو گتا کوشل نے لداخی زبان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''یہ اپنی جگہ ایک مکمل زبان ہے۔اس میں تحقیق کی اُپج اور صلاحیت ہے۔ ہر قسم کا ادب اس میں تخلیق ہوسکتا ہے اور کسی دوسری زبان کے سہارے کی اسے ضرورت نہیں ہے''۔[۲]

دوا ور لداخی زبان کے غیر لداخی سکالر ڈاکٹر روینہ اگروال اور ہیلسن نانورنج کا بھی خیال یہی ہے کہ لداخی ایک

۱۔آبادی،محمد یوسف حسین؛تاریخ بلتستان بلتستان بکڈپو نیا بازار،سکردو،۲۰۰۳،ص:۳۳۷

۲۔شیخ،عبدالغنی؛لداخ:تہذیب وثقافت،کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز،۲۶۷،جوگی گیٹ،جموں(۱۸۰۰۰۱)۲۰۰۵،ص:۳۱۷

جامع زبان ہے۔دونوں خواتین لداخی زبان جانتی ہیں۔بلتی پر بھی ان کی اس اراء کا اطلاق ہوتا ہے۔تاریخ ادبیات بلتستان کے مصنف محمد حسن حسرتؔ رقم طراز ہیں:

''بلتی زبان لوک ادب کے اعتبار سے مالا مال ہے[1]

بلتی ادب میں لوک کہانیاں ،داستانوں ،لوک گیتوں ، پہیلیوں ،لوریوں ،کہاوتوں ،روایتوں اور ضرب الامثال کا وافر ذخیرہ موجود ہیں۔

بلتی اور لداخی ادب میں کیسر کی طویل رزمیہ داستان بڑی مشہور ہے۔اس کا جرمنی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔بلتی اور لداخی ایک ہی زبان ہے تاہم زبان دانوں کا یہ ماننا ہے کہ بلتی تلفظ لداخی کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔بلتی زبان میں ترجمے کا کام بھی ہوا ہے۔محمد یوسف حسین آبادی کے علاوہ شیخ جعفری نے ۱۳۸۹ میں قرآن مجید کا ترجمہ بلتی میں کیا ،شاہ عباس نے متی کی انجیل مقدس کا ترجمہ ''کھوم لوکھسی لم'' کے نام سے اور صحیفہ مہدیہ عربی کا ترجمہ سید مرتضٰی شیگری نے ۱۹۸۸ میں بلتی میں کیا ہے جبکہ صحیفہ سجادیہ کا بھی بلتی ترجمہ ہوا ہے۔محمد صادق ہرداسی نے اپنے ایک حالیہ مضمون 'بلتی زبان کی ابتداء تاریخ اور موجودہ صورت حال' میں لکھا ہے۔بلتی زبان میں افسانوں کے کئی مجموعوں کے علاوہ اسٹیج اور ریڈیائی ڈرامے پچھلی کئی دہایئوں میں منظر عام پر آئے ہیں۔نیز ریڈیو البموں کے علاوہ ضلع کرگل میں جدید بلتی غزلوں کے تقریباً دس البم مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔لیہہ اور کرگل کے علاوہ ریاست اتراکھنڈ کے کئی شہروں میں آباد ادب نواز بلتی ،بلتی زبان وادب کی ترقی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔لداخ کے علاوہ بلتستان جو آبادی کے لحاظ سے اور زبان وادب کے لحاظ سے زرخیز ہے۔یہاں بھی بلتی زبان وادب کی خاطر خواہ خدمت ہو رہی ہے اور بلتی زبان میں چاہے نظم ہو یا نثر روز بہ روز ترقی کی جانب گامزن ہے۔

اس مقالے میں موضوع کی مناسبت سے مختلف ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

باب اول: مختصر تاریخ لداخ و بلتستان کے تحت اس میں لداخ و بلتستان کی تاریخ سے بحث کی گی ہے۔ساتھ ہی ساتھ یہاں کی تہذیب وثقافت کے بارے میں سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔لداخ اور بلتستان جغرافیائی محل وقوع اور تاریخی لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل خطے رہے ہیں۔اس خطے کی تاریخ کے بارے میں انگریزی ،اردو اور لداخی میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔نیز تاریخ سمیت تہذیب اور ثقافت وغیرہ پر متعدد مضامین قلم بند اور شائع کئے گئے ہیں جو قومی ،مقامی اور بین الاقوامی سمیناروں میں وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے تھے۔لکھنے والوں میں یوروپی ،ملکی اور مقامی

۱۔حسرتؔ ،محمد حسن؛ تاریخ ادبیات بلتستان ،ٹی ،ایس ،پرنٹرز گوالمنڈی ،راولپنڈی ، ۱۹۹۲ء ص:۱۶

مورخین، محققین اور اسکالر شامل ہیں۔ اپنی طویل تاریخ کے دوران لداخ و بلتستان کو مبلغوں اور پرچارکوں نے ایک قدیم مذہب بون سمیت ہندو دھرم، بدھ مت اور اسلام سے روشناس کرایا۔ دونوں خطے صدیوں تک محکوم بھی رہے اور آزاد و خود مختار بھی رہے۔

''**باب دوم: بلتی زبان کی ابتداء اور ارتقاء**'' کے ضمن میں بلتی زبان جو لداخ و بلتستان کے علاوہ ریاست اتراکھنڈ کے کالسی گیٹ، ہماچل پردیش کے لاہول اور سپتی، نیپال کے مستانگ اور کشمیر کے ترال میں بولی جانے والی زبان ہے۔ اس کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلتی زبان کی آغاز کے بارے میں عمومی طور پر دو نظریئے ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ یہ تبّتی زبان کی دین ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بلتی زبان اپنے خطے میں تبت سے تعلقات اور میل جول سے پہلے مروج تھی۔ تاہم محققوں کی متفقہ رائے ہے کہ تبّتی زبان نے بلتی کو رسم الخط دیا اور اس کو فروغ دیا۔ لداخ اور بلتستان کے ہمسایہ ملکوں اور علاقوں کے ترک، منگول، درد اور کشمیری تاجروں، مبلغوں، حملہ آوروں اور نوآبادکاروں کی زبانوں اور بولیوں نے بلتی زبان پر اثر ڈالا ہے اور اس کے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔

''**باب سوم: خطہ لداخ و بلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات**'' کے تحت اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح اردو زبان لداخ و بلتستان میں مغلوں کی حکومت کے دوران رابطے کی زبان کے طور پر پروان چڑھی۔ جب سے اردو زبان وجود میں آئی لداخ و بلتستان میں آنے والے پنجابی اور کشمیری اردو دان تاجروں کی وساطت سے لداخی اور بلتی اردو سے آشنا ہوئیں۔ بعد میں ڈوگرہ حکومت نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا۔ اس لئے اردو زبان کا اثر مقامی زبان پر ہونا لازمی تھا۔ اردو نے آگے چل کر بلتی کو اپنا رسم الخط دیا۔ آج بلتی میں اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی سینکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ اردو لداخ اور بلتستان کی مقامی زبان کے بعد مقبول عام زبان ہے۔ دونوں خطوں میں اردو اور بلتی زبان میں اخبارات چھپتے ہیں۔ جن کے ہزاروں قارئین ہیں۔ مذہبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی تقریبات میں بلتی اور اردو دونوں زبانوں کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے بلتی زبان و ادب پر اردو کے دوررس اثرات ثبت ہوئے ہیں۔ ان تمام نکات پر اس باب میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

''**باب چہارم: بلتی زبان کے معروف شعراء کی تخلیقات اور ان پر اردو کے اثرات**'' اس باب میں بلتی زبان کے معروف شعراء کی حالات زندگی اور ان کی تخلیقات سے بحث کی گی ہے اور ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تخلیقات پر اردو زبان کا کیا اثر پڑا ہے اس حوالے سے بھی روشنی ڈالی گی ہے۔ بلتی شاعری کا ڈھانچہ اردو پر قائم ہے۔ بلتی میں اردو اصناف سخن جیسے غزل، قصیدہ، مرثیہ، نعت، مثنوی، قطعہ اور رباعی کا چلن ہے اور یہ سب عوام الناس میں مقبول

ہیں۔بلتی شاعری میں اردو فن عروض جیسے قافیہ پیمائی، بحر اور وزن کے قواعد کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔اور شعراء کے کلام میں اردو کے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔

''**باب پنجم: (حصہ اول) بلتی زبان کے معروف نثر نگاروں کی تخلیقات اور ان پر اردو کے اثرات**'' میں بلتی کے اہم نثر نگاروں کی تخلیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلتی زبان میں شاعری کے بالمقابل میں نثر نگاری کا ادبی سرمایہ کم ہے۔تاہم حالیہ برسوں میں بلتستان میں نثری ادب میں اچھا کام ہو رہا ہے۔ماضی میں بلتی عوام اور زبان پر جنگ نامہ حضرت علیؑ، جنگ نامہ امیر حمزہ جیسے موضوعات کے اثرات دیکھے گئے ہیں جو اردو کی دین ہیں۔نیز قصہ طوطا مینا، رستم و سہراب اور الف لیلا جیسی داستانیں مقبول تھیں۔فی زمانہ اردو فکشن، تنقید، انشائیہ، خاکہ نگاری، سفرنامہ وغیرہ اردو دانوں اور بلتی ادیبوں کو زیادہ پسند ہیں۔جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی نگارشات پر اثر انداز ہیں۔زیر نظر باب میں بلتی نثری ادب کے اس مثبت میلان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''**باب پنجم: (حصہ دوم) بلتی کہاوتوں پر اردو کے اثرات**'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ہر زبان کی طرح بلتی زبان میں بھی کہاوتیں ہیں جنہیں کتابی صورت میں مرتب کیا گیا ہے اور ان کی انگریزی اور اردو متبادل کہاوتیں دی گئی ہیں۔یا ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔متعدد کہاوتوں میں اردو کے الفاظ اور اسلامی نام پائے جاتے ہیں۔جو اردو کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ان کہاوتوں میں علم و دانش کی باتیں اور فکر و نظر کی گہرائی ہے۔چند کہاوتوں کا پس منظر کوئی نہ کوئی تاریخی یا سماجی واقعہ ہے۔ان کہاوتوں کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔یہ تحقیق طلب ہے کہ ان پر اردو کا اثر کیسے اور کہاں تک پڑا ہے۔مختصر طور پر مذکورہ باب میں بلتی زبان و ادب پر اردو زبان و ادب کے اثر و نفوذ کا مطالعہ، جائزہ اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی گی ہے۔

الغرض ان تمام مراحل کو طے کرنا اور اپنے مقصد تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار گزار امر تھا لیکن تشکر الٰہی کے بعد تمام اساتذہ کرام خصوصاً استاد محترم پروفیسر ایس، ایم انوار عالم (انور پاشا)، عبدالغنی شیخ، عبدالحمید تنویر، کاچو اسفندیار، الحاج محمد باقر پشکیم، والدین، عزیزوں اور دوستوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی وجہ سے یہ کام پائے تکمیل تک پہنچا۔ان تمام محسنین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔میں ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے راقم الحروف کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوزا اور میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

ولایت علی منتظری

ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔67

باب اول

مختصر تاریخ لداخ وبلتستان

مختصر تاریخ لداخ وبلتستان

تاریخ سے مراد گزشتہ رونما ہوئے واقعات و حادثات ہیں ۔خطہ لداخ اوربلتستان میں رونما ہوئے واقعات و حادثات بہت ہیں اس کی تاریخ بہت لمبی ہے۔اس پر کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں لکھی گئی ہیں۔اردو زبان میں مولوی حشمت اللہ کی کتاب ''مختصر تاریخ جموں وکشمیر'' اور کاچو سکندر خان سکندرؔ کی کتاب ''قدیم لداخ'' بہت ہی ضخیم کتابیں ہیں ۔تاریخ جموں وکشمیر میں مولوی صاحب نے جموں، کشمیر، کشتواڑ، لداخ، تبت اوربلتستان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے رسم ورواج، اوراد بیات کے حوالے سے بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اگر ہم لداخ اور بلتستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس مقالے میں اس کے ہر گوشے کو سمیٹنا مشکل ہے لہذا اس کے اہم گوشوں پر ہی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مورخین کے مطابق امرتسر معاہدے کے بعد ۱۸۴۶ء میں گلاب سنگھ جموں وکشمیر کے مہاراجہ بن گئے۔مہاراجہ نے دوصوبے بنائے۔جموں اور کشمیر۔اور دوسرحدی علاقے لداخ اور بلتستان کو الگ درجہ دیا۔لداخ کو ایک وزارت کے طور پر تشکیل دیا اوراس کے لئے ایک وزیر وزارت کو معین کیا۔لیہہ، کرگل اور سکردوان تینوں کو الگ الگ تحصیل کے طور پر شمار کیا جاتا تھا۔وزیر چار چار مہینہ ہر ایک تحصیل میں گزارتا تھا۔لیکن تمام عملے اور وسائل کو منتقل کرنے میں حکومت کو بڑے اخراجات آتے تھے اس لئے اس نے لیہہ اور سکردو تک ہی اپنی وزارت کو محدود کرلیا۔کرگل قصبہ سکردو، لیہہ اور سرینگر سے آنے جانے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔زنسکار پہلے ضلع کشتواڑ کا حصہ شمار کیا جاتا تھا لیکن بعد میں کرگل تحصیل کا حصہ بن گیا۔۱۹۷۹ء لیہہ اور کرگل کو الگ الگ ضلع کا درجہ دیا گیا۔

(الف) لداخ:

خطہ لداخ موجودہ دور میں ہندوستان کا ایک دور افتادہ علاقہ ہے۔یہ علاقہ ریاست جموں وکشمیر کا ایک حصہ ہے۔ریاست جموں وکشمیر تین خطوں جموں، کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔رقبہ کے لحاظ سے خطہ لداخ بہت بڑا ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے چھوٹا۔یہاں کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔لداخ اب دوضلعوں پر مشتمل ہے کرگل اور لیہہ۔

ضلع کرگل:

ضلع کرگل:۔ضلع کرگل کو پرگ[1] کے نام سے بھی جانا جاتا ہے مورخوں نے لکھا ہے کہ دراصل کرگل کا نام گرکھل تھا جہاں

۱۔پرگ کی وجہ تسمیہ، صفحہ ۲

لوگ آس پاس یا دور دراز سے آ کر رکتے تھے اور قیام اور طعام کے بعد رخت سفر باندھا کرتے تھے۔اسے گرکھل کہا جاتا تھا اس سلسلے میں لداخی اسکالر سونم پونچک لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق کرگل سے مراد گرکھل ہے۔کرگل ایک ایسا مقام ہے جہاں چاروں طرف سے لوگ کاروبار کے لئے آ کر ٹھہرتے تھے پنجاب ،کشمیر،زنسکار، لیہہ، بلتستان ،گلگت، یارقند سے لوگ کاروبار کے سلسلے میں آ کر رکتے تھے۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گرکھل، کرگل ہوگیا۔جس طرح کشب رشی سے کشمیر ہوگیا۔آگے وہ مزید لکھتے ہیں۔دوسری وجہ تسمیہ نویں صدی میں چیلاس سے دردنسل کے تین بھائی آ کر پونس نے پوئن اور بقچو نے بروکو بسایا، تیسرے بھائی کرگیل نے پوئن سے تیر چلایا جو کرگل کے موجودہ بازار کے اوپر تمنوسا (ایک جگہ کا نام) پر گرا اور گاؤں آباد کیا۔اس کے نام پر گاؤں کا نام کرگیل پڑا۔بعد میں بگڑ کر کرگل ہوگیا۔ (سونم پونچک :لداخ کی کہانی، جید پریس، بلیماران دہلی، ۲۰۰۰۶ا، ص:۸۱)

قدیم لداخ کے مصنف کاچوسکندر خان سکندر یوں لکھتے ہیں کہ:

''سوت میں اپنی حکومت مستحکم کرنے کے بعد ٹھاٹھا خان نے اپنی توجہ رفاہِ عامہ کے کاموں کی طرف مبذول کی۔موجودہ دیہات پوئین شلکچے اور کرگل کو جنگل صاف کر کے آباد کیا۔پوئین اور کرگل میں کرگیل نامی آدمی کے ذریعہ آبادی کا آغاز کرایا اور لداخ واسکردو کے لوگوں کو ترغیب دے کر وہاں بسایا۔ساتھ ہی اوما چک تھنک کو بھی آباد کیا۔جہاں اس کے خاندان کی ملکیتی زمین اب تک موجود ہے۔برو میں بغ چو نامی درد کا خاندان پہلے سے آباد تھا رفتہ رفتہ برو، منجی اور گنڈا،، پر بھی ٹھاٹھا خان کا تسلط ہوا اور وہاں آبادی میں توسیع کی گئی۔اسی طرح موجودہ موضع ٹرسپون کو دریا کے کنارے کی طرف سے آباد کیا۔ٹرسپون کی پہاڑی پر (موجودہ عالیشان امام باڑہ کے متصل) سیموکھر تعمیر کیا۔جس کا نشان اس وقت موجود ہے۔ٹرسپون یعنی ''جنات کا گاؤں'' کا نام بدل کر لونچھے رکھا۔ا

۔صفحہ۲۔پوریگ کی وجہ تسمیہ۔بقول کاچوسکندر خان سکندر:

ایک روایت کے مطابق لفظ (پرگ) ''پوریگ'' لفظ ''پوت ریکس'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔پوت ریکس تبتی ترکیب ہے اور اس کے معنی تبتی الاصل کے ہے۔یہ نام اس زمانے میں پڑا جب تبتیوں نے پریگ میں سب سے پہلے مرکزی حکومت قائم کی جس کا مرکز موجودہ علاقہ پھوکر تھا۔دوسری وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پوریگ کا علاقہ چونکہ ٹیوب کی شکل کی چھوٹی چھوٹی وادیوں پر مشتمل ہے۔اس لئے یہ سارا علاقہ پوریگ کے نام سے موسوم کیا گیا، تیسری وجہ فرینکی نے اپنی کتاب کرانیکلز آف لداخ کے تشریحی نوٹ میں بیان کی ہے کہ پوریگ کا لفظ بوریگ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں بہادر نسل'' اس وجہ تسمیہ کی تائید میں فرینکی لکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں پوریگ دردوں کا ملک تھا جو بہت بہادر اور جفاکش تھے۔اسی نسبت سے یہ ملک ''بوریگ'' کے توصیفی نام سے مشہور ہوا جو بعد میں بگڑ کر پوریگ ہوا۔(قدیم لداخ ص:۱۸۸)

ا۔سکندر، کاچوا سکندر خان؛ قدیم لداخ، کپور برادرس بک سیلر، لال چوک سرینگر، کشمیر، ۱۹۷۸ء، ص:۱۹۲

لداخی مورخ اور مصنف عبدالغنی شیخ یوں رقم طراز ہیں کہ:۔

''زمانہ قدیم میں گلگت سے تین بھائی بے سروسامانی کے عالم میں پوریگ (علاقہ کرگل) آئے ان کے نام سمیان کرگی، بروا اور پوئنی تھے سمیان کرگی موجودہ کرگل کے مقام پر بس گیا اور اس کا نام کرگی رکھا۔ بعد میں کثرت استعمال سے یہ کرگل بن گیا۔ پوئنی نے دریائے سورو کے پار ایک بستی بسائی جو اس کے نام کی مناسبت سے پوئنی بن گیا۔ تیسرا بھائی برور پیچھے نہیں رہا۔ اس نے اپنے بھائی کرگی کی نئی بستی کے سامنے ایک اور جگہ آباد کی جو موجودہ بارو ہے۔''۱

عبدالغنی شیخ آگے لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی سے پہلے ہمارا کرگل قصبہ آج کی طرح مشہور نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ پشکیوم جانا پہچانا تھا۔ یورپی سیاحوں کے سفرناموں میں پشکیوم اور ملبیک کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔۲

موجودہ کرگل میں کوئی مرکزی حکومت یا بادشاہت نہیں تھی۔ اس کے گرد ونواح میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم تھیں۔ جیسے علاقہ پشکیم، ملبیک، سوت، واکھ، چکتن، لونچے، کرپوکھر، زنسکار اور دراس میں اپنے راجے تھے۔ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد یہ تمام علاقاجات ایک ہی ضلع کے اندر ضم کیا گیا۔ اور یہ ضلع ہے کرگل۔ ضلع کرگل کے صدر مقام کا نام بھی کرگل ہے۔ انتظامیہ نے اب ضلع کو نو بلاکوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور یہ ہیں کرگل، گنڈ منگلپور، سانکو، تے سورو، زنسکار، لہنگ نق، شکر چکتن، شرگول، اور دراس۔

ضلع لیہہ

ضلع لیہہ کا صدر مقام لیہہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کاچو سکندر خان سکندرؔ قدیم لداخ میں لکھتے ہیں:۔

''تبّتی خانہ بدوش کے ابتدائی طائفے غالباً چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح کے قریب موجود قصبہ لیہہ اور اس کے گرد و نواح میں آیا جایا کرتے تھے۔ انہوں نے لیہہ میں مویشیوں کے لیے لہس (encapment) تعمیر کئے۔ لہس تبّتی لفظ ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نام بعد میں بگڑ کر لیہہ ہو گیا ہو اور موجودہ قصبہ لیہہ کی وجہ تسمیہ بنا ہو،۳

عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:۔

لیہہ اصل میں ''لے'' ہے۔ اس کا لفظی مطلب نخلستان ہے۔ دلدلی زمین کے معنی میں بھی ''لے'' استعمال ہوتا ہے۔

۱،۲۔ شیخ، عبدالغنی؛ لداخ تہذیب وثقافت، ص: ۱۸۰

۳۔ قدیم لداخ، کاچو پبلی کیشنز کرگل، لداخ، ۱۹۸۷ء، ص: ۹۲)

لداخ جیسے بنجر، اوسر اور چٹیل علاقے میں زمین کا ایک شاداب ٹکڑا ریگستان میں نخلستان لگتا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں۔ ''ماضی میں مسافر جب پیدل یا گھوڑے پر کشمیر کی طرف سے لیہہ کے مغرب میں پانچ کلومیٹر دور گاؤں سپتیک کی کھریا مٹی کے ٹیلے کے موڑ پر پہنچتا تھا تو دور سے لیہہ ایک لمبی سبز لکیر کی طرح نظر آتا تھا۔ لیہہ صدیوں تک سنٹرل ایشیا کی تجارت کا مرکز اور مختلف قومیتوں کے لوگوں کا سنگم رہا''۔ (لداخ تہذیب وثقافت، ص:۱۲۳)

ضلع لیہہ:۔ چھوشوت، کھلسی، سسپول، دیسکیت (نوبرا)، پانا مک، نیوما، دربوک، کھرو، نیمو، ٹھکرشے، سکرچن،۔ ونلا، ترتک، رونگ چھوغت۔ چھوماتھنگ، ریشو۔ یوگا، لیہہ قصبہ سمیت ۷ ابلاک پر مشتمل ہے۔

لداخ کا تاریخی پس منظر:

لداخ کی قدیم تاریخی کی کہانی بہت لمبی چوڑی ہے اس لئے ہم مختصر طور پر کچھ اہم نکات کو ہی بیان کرتے ہیں۔

خطۂ لداخ میں چار ہزار سال قبل مسیح لوگوں نے بسنا شروع کیا اس سلسلے میں عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

''۹۷۔۱۹۷۷ء میں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے چند ماہرین کو سروے کے دوران اپچی گاؤں کے پاس دریائے سندھ کے کنارے پتھر کے اوزار ملے اور کیرے گاؤں میں کھدائی کے دوران قدیم چولہے، جانوروں کے باقیات، ٹوٹے پھوٹے برتن کے ٹکڑے اور پتھر کے سامان ملے۔ تجزیئے سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ۴۷۰۰ سال قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتی ہیں''۔ ۱

لداخ کو ابتداء میں تبت کو چک کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بقول عبدالغنی شیخ لداخ کا قدیم ترین نام " جنگ جونگ'' تھا۔ جنگ جونگ لداخ میں پائی جانے والی نادر بکری ''نیان'' کا اصلی نام ہے اسی سے عظیم لداخ کا نام پڑا جو کیلاش مانسرور سے سوات تک پھیلا ہوا تھا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے لداخ کا نام ''مریول'' تھا جس کا مطلب سرخ دیش تھا، یہ نام اکثر مقامات پر پہاڑ اور مٹی کا رنگ سرخ مائل ہونے کی بناء پر رکھا گیا تھا۔ لداخ نارس کورسوم سے بھی جانا جاتا تھا چونکہ لداخی راجا سکیت دے نیاں گون کے عہد میں لداخ تین صوبوں میں منقسم ہوا تھا۔ اس لئے اسے ''نارس کورسوم''، یعنی تین صوبوں والا ملک کہا جاتا تھا۔ کشمیری تاریخ نویسوں نے لداخ کو ''بڑا اور چھوٹا بھوٹا'' کہا ہے چونکہ کشمیری لداخیوں کو بھوٹہ کہتے ہیں۔ اس لئے بھوٹا نام رکھا گیا۔ لفظ بھوٹا کا مطلب بودھوں کا ملک ہے۔ فارسی داں لوگ لداخ کو تبت خورد اور تبت کالاں کے نام سے جانتے تھے۔ بہر حال اب جو نام مشہور ہے وہ نام ''لداخ'' ہے۔

۱۔ شیخ، عبدالغنی؛ لداخ تہذیب وثقافت، کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، جموں (جے اینڈ کے) انڈیا؛ ص،۲۲۔

لداخ تبّتی یا لداخی لفظ ہے اس سے مراد، درے پر بود و باش کرنے والے ہیں۔لا، لداخی میں درّے کو کہتے ہیں اور داقس، ساکنان یا رہنے والے کو کہتے ہیں۔''لاداقس'' بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے لداخ میں تبدیل ہو گیا۔اور اب لاداقس کے بجائے لداخ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

آج کل گلگت بلتستان کو لداخ میں ضم کرنے کی بات ہو رہی ہے ان دو خطوں میں بھی دنیا کی بڑی بڑی چوٹیاں مثلاً کے ٹو، سیاچن وغیرہ موجود ہیں۔اور پورے طور سے ان کی تہذیب و ثقافت بھی لداخیوں سے ملتی جلتی ہیں لہذ الداخ عظمیٰ (گریٹر لداخ) کی مانگ کی جارہی ہے۔

لداخ کی موجودہ آبادی زیادہ تر تین بڑی نسلوں مون، درد اور منگول نسل پر مشتمل ہے۔باقی اور نسلیں انہیں تین نسلوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہیں۔سب سے پہلے نقل مکانی کر کے آنے والوں میں مون قوم ہے مون کی تاریخ یہ ہے کہ یہ لوگ ہما چل پردیش سے آئے تھے۔اور انہیں ہندوستان کی سب سے قدیم نسل مانا جاتا ہے۔کاچو سکندر خان نے فرینکی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مغربی تبت کے گاؤں میں ایک یا متعدد گھرانے ایسے ہیں جو مون کہلاتے ہیں۔یہ لوگ زیادہ تر سازندے یا ترکھان ہیں۔باقی لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ان کی سماجی طور پر اس پست حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو تبتیوں سے الگ تھی اور بعد میں غلام بنایا گیا تھا۔لیکن لداخ کے بہت سے علاقوں میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ مون لوگ اصل میں کون تھے۔کیونکہ وہاں مونوں کے ورود کے بعد اور وسطی تبت کے لوگوں کے ورود سے پہلے دردوں کی ہجرت واقع ہوئی تھی۔اس لیے مونوں کے متعلق لوگوں کی یادیں دھندلی ہو چکی ہیں۔لیکن زانسکار میں صورت حال الگ ہے۔زانسکار میں بظاہر درد قوم کے لوگ کبھی نہیں پہنچے (جو غلط ہے) اس لیے وہاں واقعات کا سلسلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے، زانسکار کے سفر میں میں نے مون قبیلے کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ امور دریافت کی ہے۔ان میں ایک یہ کہ مقامی روایت کے مطابق ایک زمانے میں سارا زانسکار مونوں کے قبضے میں تھا۔ان کے پُرانے قلعوں کو اب تک مون کھر یعنی ''مون کے قلعے'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بعد ازاں تبّتی لوگ آئے اور مونوں کی دوبارہ واپسی تک زانسکار پر قابض رہے۔پھر مون قوم کے لوگ دوبارہ قابض ہوئے۔یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ اہل زانسکار تمام کشمیریوں، ہندستانیوں اور ڈوگروں کو مون کہتے ہیں''۔۱

مون قوم کے بعد درد قوم لداخ آئی۔مورخین بتاتے ہیں کہ درد گلگت اور اس کے اطراف سے آئے اور مختلف

۱۔سکندر کاچو سکندر خان؛ قدیم لداخ، تاریخ و تمدن؛ ص، ۴۱

علاقوں میں پھیل گئے۔دردوں نے لداخ پر اپنا تسلط جمانے کے بعد مون نسل کے لوگوں کو بھگا دیا یا غلام بنالیا۔دردوں کو برقپہ بھی کہا جاتا ہے۔یہ اس لئے کہ زمانہ قدیم میں یہ لوگ بستی سے دور بالائی چراگاہوں میں رہتے تھے۔دراصل بلتی زبان میں بروق، چراگاہ کو کہتے ہیں۔

منگول:۔منگولوں کی آمد کا ذکر ایک اسکالر نے یوں کیا ہے:

''لداخ میں آبادی کے آغاز سے پہلے تبّتی خانہ بدوش اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے کے لیے لداخ کی چراگاہوں میں لاتے اور واپس لے جاتے تھے۔پھر دھیرے دھیرے انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی اور دردوں اور مونوں کے ساتھ مل کر خطہ لداخ میں آبادی شروع کی اور خطہ کے دور دراز علاقے آباد کئے۔اس طرح خطۂ لداخ کی آبادی ان تینوں نسلوں کی علیحدہ علیحدہ اور مشترکہ نسلوں سے بڑھتی گئی''۔۱

مذکورہ اقتباس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ منگول پہلے سے خطہ میں موجود تھے۔لیکن وہ لوگ یہاں کے باشندے نہیں تھے۔دھیرے دھیرے انہوں نے یہاں آباد ہونا شروع کیا۔

خطۂ لداخ میں راج دربار کی ابتداء:

خطۂ لداخ میں راج دربار کی ابتداء سکیت دے نیما گوں کی سلطنت سے ہوئی تھی۔اس سے پہلے لداخ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بٹا تھا باقاعدہ طور پر حکومت نیما گوں سکیت کے بعد ہوئی۔سکیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا خاندان تبت پر حکمرانی کر رہا تھا لیکن تبت کے دوسرے راجاؤں کو اپنی زیر حکومت نہیں لا سکا۔نیما گوں نے سوچا کہ کیوں نہ مغربی تبت پر حملہ کرے۔اسی اردے کے ساتھ انہوں نے مغربی تبت یعنی لداخ پر حملہ کیا۔اس سلسلہ میں مولوی حشمت اللہ لکھتے ہیں:

''لنگ ترما کی اولاد کے درمیان جو خانہ جنگی ہوئی اس کا انجام یہ ہوا کہ حکومت اس خاندان سے جاتی رہی۔ادت شنگ کے بیٹے الدے سپل کھورسن نے بڑی بھلی طرح اپنی زندگی کے دن بسر کئے۔اس کے بڑے بیٹے ٹھی سگپال نے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی۔مگر چھوٹے بیٹے سکت الدے یا بروایت دیگر ٹھی کیدا نیما گوں کو یہ ذلت گوارا نہ ہوئی اور وہ ایک سو(۱۰۰) سوار اپنے ساتھ لے کر نارس یعنی مغربی تبت کی طرف اپنی قسمت آزمائی کی غرض سے روانہ ہوا،،۔۲

۱۔رقیہ بانو؛لداخ میں اردو زبان وادب،شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی،حضرت بل،سرینگر،۲۰۱۴؛ص،۶۴

ا۔لکھنوی،مولوی،حشمت اللہ؛مختصر تاریخ جموں وکشمیر،جے،کے،بک ھاوس،ریذیڈنسی روڑ،جموں(توی)،۱۹۹۸ء،ص:۲۳۰

مولوی صاحب نے نیما گوں کی سلطنت کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے ''نیما گون نے بتدریج تمام ملک نارس پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور نظام حکومت درست کر کے ایک با قاعدہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے تین بیٹے سپلگی گون۔ ٹشی گون۔ اور الدے سوک گون تھے۔ نیما گون نے اپنی آخری عمر میں اپنا ملک مفتوحہ ان تینوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ سپلگی گون کو ستوت مریول وشام (رودق سے کشمیر کی سرحد تک) بشمول زانسکار وسپتی۔ ٹشی گون کو پورانگ اور الدے سوک گون کو، کوگے جسے ژانگ ژدنگ بھی کہا جاتا ہے۔ ورثہ میں ملا۔ سکیت دے نیما گون کے بعد ان کی اولاد نے انیسویں صدی کے وسط تک لداخ پر حکمرانی کی۔ ان تمام حکمرانوں کی کارکردگی کو مختصر طور پر یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

لہاچن سپلگی گون:

لہاچن سپلگی گون کی حکومت ۱۰۰۰ء سے ۱۰۳۵ء تک رہی۔ لہاچن سپلگی گون نے شے میں قلعہ بنایا اور وہیں سے حکومت کرنے لگا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ قلعہ اب تک موجود ہے۔

لہاچن چھوس گون:۔

لہاچن چھوس گون سپلگی گون کا چھوٹا بیٹا تھا انہوں نے ۱۰۳۵ء سے ۱۰۵۰ء تک حکومت کی۔ چھوس گون کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا کھورے تخت نشین ہوا۔ کھورے نے حکومت کی زمام کو اپنے جوان بیٹے کارازا کے حوالے کر کے خود لاما ہو گیا۔ انہوں نے لوسا وار نچن زانگپو کو اپنا چیلہ بنا کر حصول تعلیم کے لیے ہندوستان بھیجا جو فارغ التحصیل کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے اور اپنے مذہبی فرائض انجام دینے میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنی حیات میں الچی لہا کھنگ اور مختلف گونپے تعمیر کیے۔ الچی لہا کھنگ لاما یوروگنپہ کے بعد لداخ کی قدیم ترین مذہبی تعمیرات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی خدمات کے بارے میں رقیہ بانو نے لکھی ہے:

> ''زانگپو نے زوجیلا اور کیلاش پربت کے درمیان ۱۰۸ گونپے اور چھورتن تعمیر کئے اور اس ملک میں بودھ مت کی اشاعت کی۔ ان کے تعمیر کردہ گونپے اس ملک میں بودھ مذہب کی سب سے اولین تعمیرات ہیں''۔۱

لہاچن ٹاکپا الدے:۔

لہاچن ٹاکپا الدے چھوس گون کے بڑے بھائی ڈدگون کا بیٹا تھا۔ انہوں نے ۱۰۵۰ء سے ۱۰۷۵ء تک زمام حکومت سنبھالی۔

لہاچن چانگ چوب سمسپا:۔

لہاچن چانگ چوب سمسپا،۱۰۷۵ء سے۱۱۰۰ء تک تخت نشین رہے۔ یہ لہاچن ٹکپا الدے کا بیٹا تھا۔

لہاچن رگیاپو:۔

کہا جاتا ہے کہ اس گیاپو نے لیکیر علاقہ میں شاہی گنپہ تعمیر کیا تھا۔اس زمانے میں لداخ کی بڑی شاہراہ لیکیر سے گزرتی تھی اور وہاں سے ہمس اور تمسگام جاتی تھی۔ یہ گنپہ لداخ کے قدیم ترین گنپوں میں شمار کیا جاتا ہے۔انہوں نے کیلاش پربت اور جھیل مانسرور وغیرہ کے علاقہ میں رہنے والے گوشہ نشینوں کی سرپرستی بھی کی۔

لہاچن اوت پالا:۔

لہاچن اوت پالا نے ۱۱۲۵ء سے ۱۱۵۰ء تک لداخ پر حکمرانی کی۔ یہ لہاچن رگیاپو کا بیٹا تھا۔ان کے بارے میں عبدالغنی شیخ نے لکھا ہے:

''سکیت دے نیما گون کی اولاد میں ایک حکمران لہا چھن اوت پالا (۱۱۱۰ء۔۱۱۸۰ء) بڑا جنگجو تھا۔ایک طرف اس نے کلو، پورانگ اور نیپال کا ماستنگ علاقہ فتح کیا اور دوسری طرف تقریباً سارا بلتستان اپنے قبضے میں لایا''۔۲

لہاچن نق لوک:

لہاچن نق لوک، لہاچن اوت کا بیٹا تھا۔مولوی حشمت اللہ کے مطابق اس نے ۱۱۵۰ء سے ۱۱۷۵ء تک لداخ پر حکومت کی۔اس گیاپو کے بارے میں کاچو سکندر خان لکھتے ہیں کہ:

''اس نے خلسی (کھلسی) میں مابوکھر والی کسٹم چوکی کو اٹھا دیا اور اس مقام پر جہاں موجودہ پل خلسی (کھلسی) واقع ہے نئی چوکی بنوالی۔اس کے متصل دریائے سندھ پر پہلا پل تعمیر کیا تاکہ مذکورہ چوکی پر رسوم پرمٹ کی وصولی ہوسکے۔خلسی (کھلسی) کی دردبستی کے آخری حکمراں ((غالباً رگیابن اور سری ما)) غالباً اس کے ماتحت تھے''۔۳

۱۔رقیہ بانو، لداخ میں اردو زبان وادب، ص:۳۱

۲۔شیخ، عبدالغنی؛ لداخ تہذیب وثقافت، کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، جموں (جے اینڈ کے) انڈیا؛ ص،۳۲

۳۔ا۔سکندر، کاچو سکندر خان؛ قدیم لداخ، تاریخ وتمدن؛ ص،۱۰۶

لہا چن گے بے، لہا چن گے بوم:۔

لہا چن گے بے، لہا چن گے بوم نے ۱۱۷۵ء سے ۱۲۰۰ء تک لداخ پر حکمرانی کی۔ وہ لہا چن نق بوک کا بیٹا تھا۔

لہا چن جولدر:۔

لہا چن جولدر نے ۱۲۰۰ء سے ۱۲۲۵ء تک حکمرانی کی۔

لہا چن کراشس گون:۔

لہا چن کراشس گون لہا چن جولدور کا بیٹا تھا انہوں نے ۱۲۲۵ء سے ۱۲۵۰ء تک زمام حکومت سنبھالی۔ ان کے عہد میں منگول شہنشاہ چنگیز خان نے تبت کو فتح کیا۔

لہا چن لہارگیل:۔

لہا چن لہارگیل نے ۱۲۵۰ء سے ۱۲۷۵ء تک لداخ پر حکمرانی کی۔ یہ کراشس گون کا بیٹا تھا۔

لہا چن چوپال:۔

لہا چن چوپال نے ۱۲۷۵ء سے ۱۳۰۰ء تک حکمرانی کی۔ ان کی حکومت میں لداخ خوش حالی کے دور سے گزر رہا تھا۔ اور انہوں نے مذہبی فرائض کو بخوبی انجام دیا۔

لہا چن مورپ :۔

لہا چن مورپ، لہا چن چوپال کا بیٹا تھا۔ اس نے ۱۳۰۰ء سے ۱۳۲۵ء تک لداخ پر حکمرانی کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دور حکومت میں لداخ سے طلباء کو وسطی تبت بھیجنے کا آغاز ہوا اور انہوں نے بون مت کا خاتمہ کر دیا اور لہاسہ علمی اور روحانی مرکز بن گیا۔

لہا چن رگیا لبورنچن:۔

لہا چن رگیا لبورنچن نے ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۰ء تک لداخ پر حکومت کی۔ وہ لہا چن مورپ کا بیٹا تھا۔ بعد میں یہ صدرالدین رنچن شاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس نے ۱۳۲۴ء سے ۱۳۳۷ء تک کشمیر پر حکومت کی۔

لہاچن شیرب:۔

لہاچن شیرب، رگیالبورنچن کا بیٹا تھا انہوں نے ۱۳۵۰ء سے ۱۳۷۵ء تک حکومت کی۔اس نے سابو نامی علاقہ آباد کیا اور وہاں چنگ کھر نامی قلعہ تعمیر کیا اور آس پاس کے گاؤں سے ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔

لہاچن ٹھی سوک الدے:۔

لہاچن ٹھی سوک الدے نے خطہ لداخ پر ۱۳۷۵ء سے ۱۴۰۰ء تک حکومت کی۔وہ لہاچن شیرب کا بیٹا تھا۔زمام حکومت کو سنبھالنے کے بعد اس نے لیہہ اور سابو میں ۱۰۸ چھورتن[1] تعمیر کئے۔

کاچو سکندر خان نے فرینکی کے حوالے سے لکھا ہے:۔

''لہاچن کھری (ٹھی) سوک الدے قدیم شاہان لداخ کے سلسلے کی آخری کڑی تھا''[2]

ان کے بعد سلطنت دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔ایک حصّہ پر لہاچن کے چھوٹے بیٹے ٹکپا بوم حکمران تھا، جس نے شام علاقہ پر اپنا قبضہ جمایا اور باقی ماندہ علاقہ پر لہاچن کے بڑے بیٹے لہاچن ٹک بوم الدے نے حکومت کی۔مورخین بتاتے ہیں کہ ٹک بوم الدے اپنے چھوٹے بھائی کے مقابل بہت ہی ملنسار اور رحم دل بادشاہ تھا۔

لہاچن ٹاکپا بوم الدے معروف الدے گیالپوئے ستوت مریول:۔

اس گیاپو (راجہ) نے لداخ پر ۱۴۰۰ء سے ۱۴۴۰ء تک حکمرانی کی۔دوران حکومت انہوں نے بدھ مت کی ترویج اور ترقی کے لیے بہت کام کیا۔اور انہی کے دور میں فرقہ گیلوکس کا پہلا گنپہ بنایا گیا۔مورخین بتاتے ہیں کہ فرقہ گیلوکس کی بنیاد سونکھا پانے رکھی تھی۔اسی گیاپو کے دورِ حکومت میں لداخ پر سلاطینِ کشمیر نے حملہ کرنا شروع کیا۔سلطان زین العابدین بڈشانے بلتستان کے راجہ کے ساتھ مل کر لداخ پر حملہ کیا۔

۱۔چھورتن سے مراد گنبد کی شکل کی مذہبی عمارت ہے جس میں مردوں کے لئے پھول رکھے جاتے ہیں۔لداخ میں انہیں پیس کر اور خاک ملا کر گوندھا جاتا ہے پھر اس سے مختلف شکل کے بُت ڈھالتے ہیں اور ان بتوں کو مردے کی یادگار کے طور پر چھورتن میں رکھ دیتے ہیں۔(لکھنوی، مولوی حشمت اللہ؛ مختصر تاریخ جموں وکشمیر، ص:۲۳۹)

۲۔سکندر، کاچو سکندر خان؛ قدیم لداخ، تاریخ وتمدن، ص:۱۱۰

ٹکپا بوم گیا لپوو ے شام:

ٹکپا بوم گیا لپو وے شام نے مولوی حشمت اللہ کے مطابق ۱۴۳۰ء سے ۱۴۵۵ء تک لداخ پر حکومت کی۔ان کی رہائش تنگ موگا نگ اور بزگو میں تھی۔ انہوں نے دو عالیشاں قلعے بنائے۔ایک تنگ موگا نگ میں اور دوسرا بزگو میں ہے۔ان دونوں قلعوں کو لداخ کے اہم ترین آثار قدیمہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

لہا چن لوٹوس چھوگدن:

لہا چن لوٹوس چھوگدن ،ٹکپا بوم الدے کا سب سے بڑا بیٹا تھا اس نے ۱۴۴۰ء سے ۱۴۷۰ء تک زمام حکومت سنبھالی۔کا چوسکندر خان نے کارل مارکس ا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''شاہِ کشمیر آدم خان کی مہم تبت بھی اسی گیا پو کے زمانِ حکومت میں واقع ہوئی۔اور لہا چن بھا گون گیا پوئے تنگ موگا نگ اور پوریک کے گھری رپون نے شاہانِ کشمیر کو کوگے فتح کرنے میں مدد دی،،ا(قدیم لداخ،ص:۱۱۴)

لہا چن بَھا گون:

لہا چن بَھا گون ،مولوی حشمت اللہ کے مطابق ۱۴۷۵ء سے ۱۵۰۰ء تک لہا چن بَھا گون نے لداخ پر حکومت کی۔مورخین بتاتے ہیں کہ یہ مدبر اور جنگ جو قسم کا آدمی تھا اور اس کے عہد حکومت میں لداخ پر کشمیر کے سلطان حسن شاہ کا حملہ ہوا۔بعض مورخین کو حملہ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔دوسرے گیا پوں (راجاؤ) کی طرح اس نے بھی بدھ مذہب کی بہت خدمت کی اور گنپے وغیرہ تعمیر کیے۔

لہا چن لہوا نگ گون اور لہا چن ٹشی گون:

لہا چن لہا نگ گون اور لہا چن ٹشی گون کا دور حکومت ۱۵۰۰ء سے ۱۵۳۰ء تک بتایا گیا ہے۔یہ دونوں لہا چن بھا گون کے بیٹے تھے۔کا چوسکندر خان نے ان دونوں شہزادوں کے بارے میں لکھا ہے:

''ملکی دستور کے مطابق تخت کا حقدار بڑا بیٹا لہوا نگ گون تھا۔لیکن چھوٹے بیٹے ٹشی گون نے جو بہت ہوشیار اور چالاک تھا اسے موقع نہ دیا۔اس کی آنکھیں نکال کر اُسے معہ اس کی بیوی اور اہلِ خاندان (خانہ) کے لنگشت کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔اسی حالت میں ا۔کارل مارکس لیہہ موراوین مشن میں پادری تھے۔

لہوا نگ گون کے تین لڑکے سیوا نگ نمگل ،نمگل گونبو اور جمیا نگ نمگل پیدا ہوئے۔تاہم ٹشی گون نے اپنی زندگی میں لداخ پر حکومت کی''۔(سکندر کا چوسکندر خان؛ قدیم لداخ،ص:۱۱۸)

اس گیاپو(راجہ) نے بھی مذہبی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مورخین بتاتے ہیں کہ انہوں نے فیا نگ علاقہ میں ایک عالی شان گنپہ کی تعمیر کی۔جوزنگا نگ سنون کراشس چھوس روزن کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس نے ہر گاؤں سے لاما بنائے جانے والے بچوں کی تعداد مقرر کی۔سولہویں صدی کے ابتدائی دور میں مغل بادشاہوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بتدریج پورے ملک میں ان کی عمل داری قائم ہوئی۔کشمیری سلاطین پر بھی مغلوں کا اثر پڑا اور انہوں نے بھی خطہء لداخ اور بلتستان پر حملے کیے۔

لداخ پر مغلوں کی حکومت:

نمگیل راجگان لداخ:

سوانگ نمگیل اول:۔اس بادشاہ نے خطۂ لداخ میں ۱۵۵۵ء سے ۱۵۶۲ء تک حکمرانی کی۔سوانگ نمگیل کو لداخ کے بہت بڑے گیاپوؤں (رجاؤں) میں شمار کیا جاتا ہے۔اس نے اپنی حکومت سنبھالنے کے بعد بہت سے علاقے فتح کئے۔اس سلسلے میں کاچو سکندر خان لکھتے ہیں:

,,سیونگ نمگل لداخ کے اولوالعزم گیاپوؤں میں شمار ہوتا ہے، چنانچہ تخت سنبھالتے ہی اپنے ارادوں کی تکمیل میں مصروف ہوا۔مشرق میں نمرنگ سے نیچے کا علاقہ۔پوریک کوگے وغیرہ۔جنوب میں زوم لانگ۔درچن درچونگ اور نیونگٹی اور مغرب میں شغرو کھا کر تسخیر کر ڈالے''

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''سیوانگ نے لداخ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وسائل آمدورفت کی طرف توجہ دی بلتستان کی سڑک، ہنولا اور زانسکار کی سڑک اور ہنوپٹہ کے راستے اہتمام سے بنوائے''۔(قدیم لداخ،ص:۱۲۶)

جمیانگ نمگل:۔

جمیانگ نمگل،اندھے لہوانگ نمگل کا بیٹا تھا انہوں نے اپنے بھائی سیوانگ نمگل کے بعد ۱۵۶۰ سے ۱۵۹۰ تک لداخ پر حکمرانی کی۔ان کے دور حکومت میں لداخ کے اندورنی حالات میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے بھائی سیوانگ نمگل کے مرنے کے بعد جن لوگوں نے ان کے بھائی کو یرغمال بنا کے رکھا تھا اور موقع پا کر بھاگ گئے تھے ان سے انتقام لینے کی کوشش کی۔سب سے پہلے وہ پرگ کی طرف متوجہ ہوا۔اس وقت پرگ میں رگیال ملک راجۂ سوت اور سرنگ ملک راجۂ چکتن کے مابین سالہا سال سے چکتن کی علیحدگی کے بارے میں کشیدگی

چلی آ رہی تھی ۔علی شیر خان مقپون راجۂ اسکردو نے ملک کی حمایت میں سوت پر حملہ کیا، اور راجۂ سوت نے علی شیر خان کے دباؤ میں آ کر مجبوراً چکتن میں سرنگ ملک کی خود مختاری تسلیم کی ۔لیکن راجۂ سوت رگیال ملک نے دوبارہ موقع پا کر پھر سے حملہ کرنے کی ہمت کی ۔اسی دوران جمیا نگ نے سرنگ ملک راجۂ چکتن کو، جو اس کا رشتہ دار تھا حمایت کرنے کا فیصلہ کیا اور پرگ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں یہ مسئلہ پیش آیا کہ لوسر (لداخیوں کا نیا سال) بہت ہی قریب تھا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوسر سے پہلے حملہ کرے ۔اس لئے راجا نے لوسر کو مقررہ وقت سے پہلے منانے کا حکم دیا۔ پہلے لوسر چھ فروری کو منایا جاتا تھا انہوں نے چھ کے بجائے پانچ یا چھ دسمبر کو منایا۔تب سے آج تک یہی روایت چلی آ رہی ہے۔

اس کے باوجود راجا کو کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ بلتستان کے راجہ شیر علی خان انچن نے بلتستان کے دوسرے راجاؤں کو متحد کر کے جمیا نگ نمگیل کے خلاف محاذ کھولا ۔جمیا نگ بوھ کھر بو، واکھا وغیرہ جنگ میں مصروف تھا۔ مجبوراً بلتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ادھر شیر علی خان نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ جب تک تمام درے اور وادیاں برف سے نہ ڈھک جائیں حملہ کرنے سے فوجیوں کو روکے رکھا۔ جیسے ہی تمام درے اور وادیاں برف سے ڈھک گئیں بلتستانی فوج نے جمیا نگ کی فوج پر حملہ کر دیا اس کے نتیجہ میں سارا لداخ شیر علی خان کے زیر قبضہ آیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جمیا نگ نے صلح کی درخواست کی جسے علی شیر خاں نے منظور کر لی۔صلح کی شرائط کی رو سے وادیٔ سندھ میں مقام غوٹھامت چھو (نالۂ گراگرا کے متصل واقع ہے) حکومتِ لداخ واسکردو کی سرحد قرار پایا، اور موضع گنوخ اور نالۂ گراگرا حکومت اسکردو کے ساتھ ملحق ہو گئے ۔بودھ کھر بو جسے جمیا نگ نے فتح کر لیا تھا اس کے عوض میں سالانہ خراج مقرر ہوا۔ جو رگیا لپوئے لداخ حکومت اسکردو کو ادا کرتا رہے گا۔جمیا نگ نے اپنی بیٹی مندوق رگیالمو کی شادی علی شیر خان سے کر دی۔تاہم علی شیر خان نے جمیا نگ کو آزاد نہیں کیا بلکہ اسے اپنی نئی رانی سمیت اسکردو لے گیا۔

اسکردو میں یبگو شیر غازی راجہ سُالنگ کھر نے اپنی بیٹی رگیال خاتون کی شادی جمیا نگ نمگل سے اس شرط پر کر دی کہ اس سے جو اولاد پیدا ہو گی وہی وارثِ تخت ہو گئی۔ جمیا نگ نے شرط منظور کی، بعد ازاں یبگو شیر غازی کی کوشش سے فریقین میں باقاعدہ سمجھوتہ ہو گیا اور جمیا نگ نے نہ صرف قید سے رہائی پائی بلکہ اس کی حکومت بھی بحال ہو گی۔اس طرح مغربی تبت کی قدیم عظیم الشان سلطنت مٹتے مٹتے بچ گئی۔رگیال خاتون کے بطن سے گیا پو سنگے نمگل اور نور بو نمگل پیدا ہوئے۔رگیال خاتون مرتے دم تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔اس کی قبر ہندر (نوبرا) میں ہے۔قبر کے ساتھ چبوترے کی شکل کی مسجد بھی بنائی گئی۔کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ شاندار مقبرہ تھا اور اس کے اوپر زریں چتر تھا۔

جمیا نگ کا خیال یہ تھا کہ جنگ میں جتنے نقصانات ہوئے تھے اس کا ازالہ اس طرح کیا جائے کہ بدھ مت کو بڑھاوا دیں اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو خوش کرنے کے لئے اپنی رعایا کا ٹیکس معاف کر دیا جائے چنانچہ راجا نے اس پر عمل کیا۔

سنگے نمگل :۔

سنگے نمگل کے بارے میں مورخین بتاتے ہیں کہ وہ بہت ہی دلیر اور شجاع حکمراں تھا۔اس نے ۱۵۹۰ء سے ۱۶۳۰ء تک حکومت کی۔اس کی ماں مسلم خاتون، بیگو شیر علی خان کی بیٹی تھی لیکن سنگے خود بودھ مذہب سے عقیدہ رکھتا تھا۔اپنے عقیدے کے مطابق اس نے بہت سے گونپے تعمیر کئے اور لوگوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کام کیا۔

ویلدن نمگل :۔

ویلدن نمگل ۱۶۲۰ء سے ۱۶۴۰ء تک تخت نشین رہا۔کہا جاتا ہے کہ اس نے لداخ کے کھوئے ہوئے مقام کو پھر سے بحال کرنا چاہا،لیکن بڑھاپے نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

دیلگ نمگل :۔

دیلگ نمگل ، ویلدن نمگل کا بیٹا تھا۔انہوں نے ۱۶۴۰ء سے ۱۶۸۰ء تک حکومت کی۔مورخین بتاتے ہیں کہ اس راجہ کے زمانے میں لداخ پر تبت اور منگولیا کی فوج نے حملہ کیا تھا۔دیلک نمگیل کی حکومت کو جب خطرہ لاحق ہوا تو اس نے اس وقت کے مغل بادشاہ اورنگ زیب سے فوجی مدد چاہی۔مغل بادشاہ اورنگ زیب نے اس کی درخواست کو قبول کیا۔اور لداخ کے لیے فوجی کمک بھیجی اس کے نتیجہ میں تبّتی اور منگولیائی فوج کو شکست ہوئی۔دیلگ نمگل مغل فوج کے سردار نواب فدائی خان کا شکریہ ادکرنے کے لیے گئے اور ان کا اسلامی نام عاقبت محمود خان رکھا گیا۔اس کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔اکثر لکھتے ہیں کہ دیلگ نمگل اپنے مذہب پر قائم رہا اور بودھ مت کو فروغ دیا۔البتہ مغل بادشاہ سے ان کی خط و کتابت عاقبت محمود خان کے نام سے ہی ہوتی تھی۔

نیماں نمگل :

نیماں نمگل ، دیلگ نمگل کا بیٹا تھا اس نے ۱۶۸۰ء سے ۱۷۲۰ء تک لداخ پر حکومت کی۔کہا جاتا ہے یہ بادشاہ لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔وہ اچھے اور لائق لوگوں کی ستائش اور انھیں تحائف سے نوازتے تھے اور نالائق اور برے لوگوں کو اپنے سے دور رکھتے تھے۔اس راجہ کے زمانے میں پہلی دفعہ ہر گاؤں کے لیے مقدم یا منصف مقرر کیا گیا۔اور ساتھ ہی ساتھ مقدمات کے فیصلے کے لیے کونسل آف ایلڈرس یا بزرگوں کی مجلس کی تشکیل دی گئی۔انہوں نے یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ

پنچایتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار دے دیا چنانچہ بادشاہ عدل وانصاف کی وجہ سے لوگوں میں مشہور ومقبول ہوا۔مغلوں سے اس کے مراسم بہت اچھے رہے۔اس نے ہمسایہ ممالک جیسے چین،تبت اوربلتستان کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی تعلقات بڑھائے۔

دیس کیونگ نمگل:۔

دیس کیونگ نمگل ۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۰ء تک تخت نشین رہا۔یہ نیما گون کا بیٹا تھا۔دیس کیونگ نمگل برائے نام بادشاہ تھا سارے اختیارات اس کی بیوی زی زی خاتون کے ہاتھوں میں تھے اسی دوران ٹشی نمگل نے ملبیک اورفوکر علاقہ پر قبضہ کرلیا۔

قونچوک نمگل:

مولوی حشمت اللہ کے مطابق قونچوک نمگل ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۵ء تک تخت شاہی پر رہا۔کہا جاتا ہے کہ دیس کونگ کے بعد سِس کیونگ نمگل کو تخت نشین ہونا تھا لیکن اس کے چھوٹے بھائی قونچوک نمگل نے اپنی ماں کی مدد سے اسے اقتدار سے محروم کردیا اور خود زمام حکومت کو سنبھالی۔

سیوانگ نمگل ثانی:۔

سیوانگ نمگل ثانی،۱۷۶۰ء سے ۱۷۸۰ء تک اقتدار میں رہا۔اس کے ساتھ ایک بڑا واقعہ یہ رونما ہوا کہ اس نے زانسکار کی ایک شہزادی کے ساتھ شادی کی۔لیکن شہزادی کے محل پہونچے سے پہلے ہی راجا نے سنگراہ کی ایک ڈومنی بی بی کو گھر میں ڈال دیا تھا اس کی وجہ سے زنسکار کی شہزادی ناراض ہوکر واپس چلی گئی۔

سیوانگ نمگل ثانی سے رعایا ناخوش تھی کیوں کہ راجہ بڑا فضول خرچ تھا۔اس نے عیش وعشرت کی زندگی گزاری اور تمام عہدوں پر نالائق افسران تعینات کئے۔آخر کار امراء سلطنت کے مشورہ پر اسے تخت وتاج سے ہاتھ دھونا پڑا۔

چھیتن نمگل:

چھیتن نمگل،سیوانگ نمگل ثانی کا بیٹا تھا۔اس نے ۱۷۸۰ء سے ۱۷۹۰ء تک لداخ پر حکمرانی کی۔کہا جاتا ہے کہ یہ زیرک اور ہوشیار بادشاہ تھا۔تبّتی علوم کا عالم تھا اور عربی وفارسی زبان بھی جانتا تھا۔رعایا اس کے دور حکومت میں خوش تھی۔یہ آمدنی کے مطابق لوگوں سے ٹیکس لیتا تھا۔لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور یہ راجا جوانی میں فوت ہوا۔

سپیل ٹنڈوپ نمگل:

سپیل ٹنڈوپ نمگل ،چھیتن نمگل کا بھائی تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ راجا بڑا انا اہل راجہ تھا حکومت کے کام کاج میں بھی خلل ڈالتا تھا اور اپنی من مانی سے افسران کا تبادلہ کرتا تھا۔اس نے زانسکار پر حملہ کر دیا جو بعد میں دونوں کی صلح اور صفائی کی وجہ سے مسئلہ حل ہو گیا اس کی اس پالیسی کی وجہ سے حکومت بہت ہی کمزور ہوگئی۔جو آگے چل کر حکومت کے زوال کی وجہ بنی۔

کاچو سکندر خان لکھتے ہیں کہ:

''ٹنڈوپ نمگل کے عہد حکومت کا ایک اور مشہور واقعہ لداخ میں والئِ انجان (چینی ترکستان) عبدالستار سولہ سواروں کے ساتھ اپنے وطن سے فرار ہو کر حدودِ لداخ میں پناہ لینے کی عرض سے داخل ہوا۔اور گیاپو سے پناہ کا خواستگار ہوا۔لیکن ٹنڈوپ نمگل نے اس کے ساتھ غداری کی اور بجائے اس کے کہ اس کو اپنے ملک میں پناہ دیتا۔اسے چینیوں کے حوالے کر دیا۔ستار نے تنہائی اور بے بسی کے عالم میں بد دعا کی،خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس واقعہ کے فوراً بعد لداخ پر ڈوگروں کا حملہ ہوا اور لداخ اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ٹنڈوپ نمگل زوراور سنگھ کے ساتھ اسکردو پہنچ کر وہیں بعارضہ چیچک فوت ہوا''۔

(کاچو سکندر خان سکندرؔ،قدیم لداخ۔ص،۱۶۹۔)

ڈوگرہ حملہ اور لداخ کی خودمختاری کا خاتمہ:۔

مغل سلطنت کے خاتمہ کے ساتھ ہی پنجاب میں سکھوں کی سلطنت قائم ہوئی۔۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے جموں پر اپنا قبضہ جما لیا۔۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کو پنجاب میں شامل کیا۔۱۸۲۳ء میں رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو جموں جاگیر میں دیا۔گلاب سنگھ نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ادھر اس وقت ہندوستان میں انگریز پورے ملک پر اپنا قدم جمانے میں مصروف تھے۔مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ سے اجازت لے کر لداخ پر حملہ کر دیا۔اور لداخ کی صدیوں سے چلی آرہی خودمختاری ختم ہوگئی۔

ڈوگرہ لداخ پر ۱۸۳۴ء سے ہندوستان کی آزادی تک راج کرتا رہا۔آزادی کے بعد لداخ سے بلتستان الگ ہو گیا۔اور لداخ جموں وکشمیر کا ایک خطہ بنا۔خطہ لداخ،وادی کشمیر اور جموں صوبہ پر مشتمل ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کی انتیس ریاستوں میں ایک ریاست ہے۔

لداخ کی لمبی تاریخ کو ایک مختصر مقالے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ظاہر ہے اس سے نہ موضوع سے انصاف ہو سکتا ہے اور نہ تشنگان علم وادب کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔تاہم لداخ سے متعلق اپنی بات کو ختم کرنے سے پہلے

قدیم لداخ اور تادم آزادی ہندوستان کے، ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی نے لداخ کی تاریخ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ انہوں نے لداخ سے متعلق یہ خلاصہ عبدالغنی شیخ کی کتاب ''لداخ: تہذیب وثقافت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قلمبند کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''لداخ خطے نے پتھر کے پرانے اور نئے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے اور تاریخ سے قبل دور میں بھی انسان بستے تھے۔ ایک پرانے چولہے کے پاس دریائی ڈھلوان دیوار پر غار بنے ہوئے ہیں جن میں قبل از تاریخ زمانے میں انسان بستے تھے۔ تبت اور لداخ میں قدیم باشندوں کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہاں آدم خور قسم کے وحشی لوگ رہتے تھے۔ ابتداء میں نقل مکانی کر کے لداخ آنے والے مون بتائے جاتے ہیں۔ مون ہماچل پردیش سے لداخ آئے جن کے قدیم آثار مون کھر ،مون گی چھورتن اور مون جینگ کی صورت میں موجود ہیں۔ لداخ میں کھر قلعے اور جینگ کھیت کو کہتے ہیں۔ بعد میں گلگت اور اس کے اطراف وجوانب سے درد قوم کے لوگ آئے اور لداخ کے مختلف علاقوں میں بس گئے۔ دردوں نے لداخ پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد مون نسل کے لوگوں کو یا تو بھگا دیا یا غلام بنایا اور جو کام وہ خود نہیں کرتے تھے وہ کام مون سے لیا۔ لداخ کے موجودہ لوگ مون، درد اور منگول نسلوں کے تھے۔ لداخ کا قدیم ترین مذہب بون تھا۔ تبت اور بلتستان میں بھی یہ مذہب مروج تھا۔ بون دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ تاہم وہ ایک خدا کو بھی مانتے ہیں۔ اس مذہب کے پیروکار تبت میں آج بھی موجود ہیں۔ بون مت کے بعد ہندو دھرم کچھ عرصہ لداخ میں مقبول رہا۔ ۲۲۴ قبل مسیح میں مہاراجہ اشوک کی ایک مشنری نے لداخ کو بُدھ مت سے روشناس کیا۔ بعد میں کشن خاندان کے پرچار سے لداخ میں بُدھ دھرم کی اشاعت ہوتی رہی۔ نویں صدی عیسوی میں سارے وسطی ایشیاء میں لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے اثرات لداخ پر بھی ظاہر ہوئے۔ چنانچہ راجہ چھتیس نمگیل (۱۸۰۸ء سال انتقال) فارسی اور کشمیری زبانیں جانتا تھا۔ لداخ کا آخری راجہ چھیل تنڈوپ نمگیل تھا جس کے زمانے میں ڈوگرہ جرنیل زورآور سنگھ نے کشتواڑ کے راستے لداخ پر حملہ کیا اور لداخ کی خودمختاری قصۂ پارنیہ بن گئی۔ ۱۸۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک لداخ پر ڈوگروں کی حکومت رہی۔ اس کے بعد لداخ، ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ جمہوریہ ہند میں شامل ہوگیا۔ سکیت دے نیما ل گون کے خاندان کی ایک ہزار سالہ لمبی حکومت کے دوران لداخ میں بدھ مت کو زبردست فروغ ملا اور لاتعداد گنپے تعمیر ہوئے۔ اِسی دور میں خطہ میں کچھ مذہبی رہنماؤں اور خدادوستوں کی تبت اور کشمیر سے آمد کے نتیجے میں یہاں اسلام پروان چڑھا اور اس وقت لداخ میں مساجد، امام باڑے اور دیگر مقدس مقامات موجود ہیں،،۔[۱]

۱۔ اسیرؔ، ولی محمد کشتواڑی؛ شیرازہ (۱۷) جے، کے، آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی، ص: ۴۶۲

(ب)۔ بلتستان

بلتستان میں بلتی لوگ آباد ہیں ۔بلتستان اس وقت پاکستان کے زیرانتظام کشمیر میں ہے اور اسے گلگت کے ساتھ ایک ریاست کا درجہ ملا ہے۔

بلتستان اور لداخ کی تہذیب، ثقافت اور زبان میں گہری یکسانیت ہے۔ دونوں میں صدیوں تک تجارتی سماجی، مذہبی اور ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔

بلتستان کے معروف مصنف یوسف حسین آبادی اپنی کتاب میں ''تاریخ بلتستان'' کا تعارف یوں رقم کرتے ہیں:

> دوسری صدی عیسوی میں یونانی جغرافیہ دان بطلیموس نے ''BYLTAE'' ذکر کیا ہے جو محققین کے مطابق بالتی ہی کا تلفظ ہے۔ تبت والے بلتستان کو نا نگ گونگ بھی کہتے ہیں۔ کشمیری لوگ اس علاقے کو لکھ بوٹن اور سوری بوٹن (ژیرہ بٹن) یعنی خوبانیوں ولا تبت کہتے ہیں ۔بلتستان صدیوں تک پولولو سلطنت کا مرکز رہا ہے۔، بلتستان کے تقریباً اکانوے فیصد باشندے تبتی نژاد ہیں اس لئے یہ علاقہ کشمیر اور ہندوستان کی تواریخ میں تبت خورد، تبت کوچک اور تبت صغیر کے نام سے مذکور ہے۔ تبت کا لفظ بلتستان کی مقامی تحریروں میں بھی بیسویں صدی کے وسط تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن مقامی باشندے اپنے آپ کو بلتی اور علاقے کو بلتی یول یعنی بلتیوں کا وطن کہتے آئے ہیں۔ بعد میں بلتی یول کا فارسی ترجمہ بلتستاں استعمال ہونے لگا جو رفتہ رفتہ اس کا مستقل نام بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کا لفظ ۱۸۴۰ء کے بعد تحریروں میں آنے لگا ہے۔ لداخ والے اسکردو کو سگر کھود (سمندر کی وادی) بھی کہتے ہیں۔[۱]

گلگت بلتستان کے دس اضلاع ہیں ۔ اور انہیں تین صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ **صوبہ بلتستان**:۔ ۱۔ ضلع گانچے، صدر مقام خپلو' ۲۔ ضلع شگر، صدر مقام شگر، ۳۔ ضلع کھرمنگ، صدر مقام کھرمنگ' ۴۔ ضلع سکردو، صدر مقام سکردو' ۵۔ **صوبہ گلگت**:۔ ضلع گلگت، صدر مقام گلگت' ۶۔ ضلع گیزر، صدر مقام گیکوچ' ۷۔ ضلع ہونزہ، صدر مقام کریم آباد' ۸۔ ضلع نگر، صدرم مقام گل میت' **صوبہ دیامیر**:۔ ۹۔ ضلع دیامیر، صدر مقام چیلاس' ۱۰۔ ضلع استوری، صدر مقام عیدگاہ۔

ہندو پاک کی جنگ آزادی کے بعد بلتیوں نے لڑائی لڑ کر آزادی حاصل کی ۔ بعد میں پاکستان میں شمولیت اختیار کر لی۔ اور ۲۰۰۹ء میں اسے صوبہ کا درجہ ملا اور پہلی بار انتخابات ہوئے۔ سید مہدی شاہ پہلے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

۱۔ آبادی، محمد یوسف حسین؛ تاریخ بلتستان بلتستان بکڈپو نیا بازار، سکردو، ۲۰۰۳، ص:۱

بلتستان کو پولولو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اس کے بارے میں محمد یوسف حسین آبادی نے تاریخ کا حوالہ دے کر لکھا ہے:

''چینی زائرین کے سفرناموں اور دیگر چینی تحریروں سے بلتستان کی قدیم تاریخ کے بارے مین معلومات ملتی ہیں ۔ان ذرائع کے مطابق پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں موجود بلتستان اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر مشتمل ایک سلطنت قائم تھی۔اس کو پولولو(POLULO) کہتے تھے۔یہ سلطنت کب سے قائم تھی اس کا علم دستیاب نہیں۔پولولو کی سرحدیں مغرب میں داریل کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔

فاہیان(FA-HSIEN)اس طرف سفر کرنے والا پہلا چینی زائر ہے جس کا سفرنامہ تحریری شکل میں اب تک موجود ہے۔۴۰۳ء میں وہ داریل (تالی لو) پہنچا۔اس نے پولولو کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتا ہے

''اس جگہ(داریل) کے مشرق میں پہاڑ اور وادیاں عبور کر کے ۵۰۰ لی کا فاصلہ طے کرنے پر آپ شمالی ہند کی سرحد پولولو میں پہنچتے ہیں''

اس وقت پولولو ایک بڑا ملک تھا جس کا مرکز بلتستان میں تھا اسی لئے بلتی آج تک اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں''۔ا

خطہ لداخ بلتستان کے دوسرے مورخین کے مطابق جب چینی سیاح فاہیان اس علاقے (بلتستان) میں داخل ہوا تو یہاں پلولولو، نامی ریاست قائم تھی جو پورے گلگت بلتستان میں پھیلی ہوئی تھی اور اسکا صدر مقام موجودہ خپلو کا علاقہ تھا۔پھر ساتویں صدی میں اس کے بعض حصے تبت کی شاہی حکومت میں چلے گئے پھر نویں (۹) صدی میں یہ مقامی ریاستوں میں بٹ گیا جن میں سکردو کے مقپون۔ا، اور ہنزہ کے ترکھان خاندان مشہور ہیں۔مقپون خاندان کے راجاؤں نے بلتستان سمیت لداخ،گلگت اور چترال تک کے علاقوں پر حکومت کی۔احمد شاہ مقپون اس خاندان کا آخری راجا تھا۔جسے ڈوگرہ افواج نے ایک ناکام بغاوت کے بعد ۱۸۴۰ء میں کشتواڑ لے لیا جہاں ان کا انتقال ہوا۔

ا۔مورخوں نے لکھا ہے کہ بلتی بادشاہ شیر شاہ کے بیٹے شیر علی خان انچن (۱۵۴۰ء تا ۱۸۶۸ء) سے مقپون خاندان کے عروج کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔علی شیر خان نے جو بعد میں انچن یعنی طاقتور کے نام سے مشہور ہوا۔لداخیوں کو شکست دے کر لداخ کے علاقے کھرمنگ پر قبضہ کیا۔بعد میں انچن نے یکے بعد دیگرے بلتستان اور لداخ پر اپنا سکہ جمایا۔اسی اثناء میں ریاست کشمیر کا مغل سلطنت سے الحاق ہوگیا۔اور انچن نے اپنی بیٹی کا رشتہ شہزادہ سلیم کے ساتھ کر دیا۔

انچن نے اس کے بعد مغرب میں اپنی حکومت کو وسعت دی اور استور،گلگت اور چترال کو فتح کر لیا۔انچن کی وفات کے بعد اس کے بیٹے آدم خان اور عبدال خان میں جھگڑا ہوگیا اس کے بعد مقپون خاندان کو زوال آیا۔(بلتستان۔آزاد دائرہ معارف وکیپیڈیا)

زورآورسنگھ نے ۱۸۴۰میں بلتستان پرحملہ کیا۔اس کے ساتھ ہی بلتی دورحکومت کا خاتمہ ہوا۔برصغیر کی آزادی کے بعد گلگت اوربلتستان پاکستان کے زیرانتظام کشمیرمیں شامل ہوئے جواب ایک صوبہ بن گیا ہے۔

بلتستان دو پہاڑی سلسلوں کوہ قراقرم اورکوہ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے۔قراقرم کی ۱۵۰چوٹیاں بلتستان کی حدود میں واقع ہیں جن میں دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی کےٹوبھی ہے۔یہ سکردو سے۲۰۱کلومیٹر کے فاصلے پرواقع ہے۔

بلتستان کا مجموعی رقبہ ۲۶،۲۰۵ مربع کلومیٹر ہے ۔۱۹۷۱ء کی لڑائی میں تقریباً ۳۸۸ مربع کلومیٹر علاقہ ہندوستان میں آیا۔یہ علاقہ تورتوک،تخشی ،چولونکھا اورتھنگ گاؤں پر مشتمل ہے۔رقبہ میں بلتستان لداخ سے چھوٹا ہے مگرآبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔

عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

’’بلتستان کی آبادی سوا چار لاکھ کےقریب ہےنوے فیصدآبادی امامیہ اثناعشریہ اورنوربخشیہ پر مشتمل ہے۔باقی آبادی اہل سنت اوراہل حدیث کی ہے۔سکردو میں چند اسماعیلی گھرانے ہیں۔اور ایک بہائی خاندان ڈوگرہ دورحکومت سے آباد ہے۔تقسیم ملک سے پہلے متحدہ ہندوستان کے شہر شملہ،مسوری، ڈلہوزی،سرینگر،کشمیراورکئی شہروں میں کم وبیش دس ہزار بلتی تھے‘‘۔۱

محمد صاق ہرداسی نے محمد حسن حسرت کےحوالے سےلکھاہے:

’’بلتستان اورکرگل لداخ کوایک ہی جغرافیائی وثقافتی زون میں واقع ہونے کے ناتے ایک سکے کے دورخ سمجھے جاتے ہیں۔ان علاقوں کی زبان ،ادب،تاریخ،ثقافت اورلوک ورثہ صدیوں سے مشترک ہے۔نسلی طور پرمنگول،مون اورآریاؤں کےمخلوط قبائل پر مشتمل ان علاقوں کی تہذیب وثقافت اورزبان کا بنیادی مآخذ تبّتی ہےلیکن ان علاقوں میں جہاں جہاں اسلام کی شمع فروزاں ہوئی وہاں مغل،کشمیری،وسط ایشیائی اورایرانی تہذیبوں کے حسین امتزاج نے سونے پرسہاگے کا کام کرتے ہوئے یہاں کی تہذیب وتمدن اورادب وثقافت کو بڑارنگین بنادیاہے۔قدیم تواریخ میں یہ علاقے تین بڑے حصوں (۱) نانگ گون یا بلتی (بلتستان)(۲)پوریگ (کرگل)(۳)مریول (لداخ) میں منقسم تھے۔سیاسی طور پر یہاں مزید چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی قائم تھیں،جن پر مقپون، یبگو،اماچہ،گاشو،نیاٹھی،استنی،لہاچن اورنمگیال خاندانوں کومختلف علاقوں پر اقتدار حاصل تھا۔پندرہویں صدی عیسوی میں سکردو کے مقپون بادشاہ علی شیرخان انچن نے تبت پورانگ سےلیکر گلگت وچترال تک کے وسیع وعریض علاقے میں فتح وکامرانی کا جھنڈا لہراکراپنا اقتدارقائم کیا۔علی شیرخان انچن کے بیٹوں اورپوتوں کے بعدرفتہ رفتہ

۱۔شیخ،عبدالغنی؛لداخ کی تاریخ کےاہم گوشے،اپلائڈ بکس، نئی دہلی،۲۰۰۰۱۱،ص:۴۷،۴۶

جب مقپون خاندان کمزور پڑ گیا تو ہر علاقے میں پھران کے سابقہ حکمراں خاندان کی اپنی اپنی حکمرانیاں قائم ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۰ء میں اندورنی انتشار کے باعث جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی فوج کے ذریعے یکے بعد دیگرے کرگل لداخ، بلتستان اور گلگت کے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کا بٹوارہ ہوا تو جہاں پاکستان اور بھارت جیسے ممالک وجود میں آئے وہاں کرگل لداخ اور بلتستان میں بھی سیاسی وجغرافیائی لحاظ سے بڑی تبدیلیاں آئیں۔بلتستان اور گلگت کی عوام نے ڈوگروں اور سکھوں کے خلاف جنگ لڑکر آزادی حاصل کر لی۔ جبکہ کرگل ولداخ کی حالت گلگت وبلتستان سے مختلف تھی۔اس دوران بھارت نے کشمیر میں فوج کشی کی اور گلگت بلتستان کی فوج کو کرگل ولداخ کی طرف بڑھنے سے روک دیا اور یہ علاقہ بھارت میں رہا۔اسی طرح بلتستان، کرگل اور لداخ کے درمیان پاک بھارت کی ایک دفاعی لکیر کھنچ گئی ہے جو آج تک قائم ہے''۔ا

الغرض اس مختصر سے مقالے میں لداخ اور بلتستان کی تاریخ کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرنا ممکن نہیں چونکہ موضوع کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ہوگا بس میں اپنی بات کو راجہ محمد علی شاہ صبا اس وسیع نظر اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

بلتستان کی تاریخ کا کھوج لگانے میں مشرق سے مغرب تک کے متعدد محققین میں سے چند ایک نے کافی تگ ودو کی ہے۔جن میں چینی اور یوروپی سیاح، مغربی محققین، ہندوستانی حملہ آور اور مشرق وسطی کے دراندازسب ہی شامل ہیں۔لیکن جن قلمکاروں نے بلتستان پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز رکھی اور اپنی کاوشوں کو بروئے کار لایا۔ان بااثر اور بھرپور وسائل کے حامل شخصیتوں میں برطانوی رائیل جیوگرافیکل سوسائٹی کے ممبر G.T.VIGNE اور برصغیر کے مولوی الحاج حشمت اللہ خان کی تحقیق کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس لئے کہ جی۔ٹی۔وین نے اپنے سفرنامہ "TRAVEL IN KASHMIR LADAKH AND SKRADO" میں مفصل طور یہاں کے ہر طبقہ کے لوگوں کی بود وباش، طرز معاشرت، تاریخ اور رسم ورواج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہر علاقہ کے حکمرانوں اور ہر طبقہ کے بااثر افراد کے ساتھ گھریلو حد تک کے تعلقات قائم کئے تھے۔

بلتستان کی تہذیب وتمدن بلکہ نجی زندگی تک کے حالات سے بھی باخبر تھے۔اور وہی سب کچھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ان کے علاوہ سمندر پار کے لکھنے والوں میں کرنل جان بڈلف، ایف نائیٹ، لارنس، کننگھم، ینگ ہسبنڈ، ڈریو، اے ایچ فرینکی اور دور جدید کے جرمن محقق ومورخ پروفیسر کارل یٹمار وغیرہ کے سفرناموں اور تاریخی نگارشات میں بھی بلتستان کا تذکرہ ہے۔لیکن زیب داستان تک ہے۔ کیونکہ ان کے مقصد وسیع اور اہداف بین الاقومی تھے۔

برصغیر کے لکھنے والوں میں ذکاءاللہ کی ''تاریخ ہندوستان''، بدایونی کی ''منتخب التوریخ''، خافی خان کا ''منتخب الباب''، کنبوھی

ا۔ ہرداسی، محمد صادق؛ بلتی مہاجرین کی مختصر تاریخ، یوسف انٹر پرائزس اسلامیہ سکول چوک، کرگل (لداخ)، ص:۱۷ا

کا ''شاہجہان نامہ''، محمد الدین فوق کی ''تاریخ کشمیر''، ہرگوپال خستہ کی ''گلدستہ کشمیر''، مرزا حیدر گوکان کی ''تاریخ رشیدی''، و غیرہ سب اپنی جگہ مکمل اور مستند سہی۔ لیکن تبت خورد بلتستان کی تفصیلی تاریخ بر سبیل تذکرہ کی حد تک ہے۔

برصغیر کے مشہور محقق مولوی حشمت اللہ خان لکھنوئی کی تحقیقات کو اس لئے مستند سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختلف حیثیتوں میں خطہ شمالی کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور تمام مقامی تاریخی مواد جمع کیا۔ جن میں معاہدات، دستاویزات اور قلمی کتابچے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیا۔ مختلف طبقہ کے تاریخ دانوں سے پوچھ گچھ کی۔ راجگان علاقہ اور پیران خانقاہ کے شجرہائے نسب بھی اٹھا کر لے گئے۔ ان کے مطالعہ سے بھی نتائج اخذ کئے اور ''تاریخ جموں'' کے نام سے ایک کتاب منصۂ شہود پر آئی۔

برصغیر پاکستان کے دور حاضر کے لکھنے والوں میں جناب احمد حسن دانی صاحب (پروفیسر ایمریٹس قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد) اور زبیدہ مصطفیٰ نے خطہ شمال کے آثار قدیمہ اور تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن بلتستان کا جہاں تک تعلق ہے خطہ شمال کے ایک گوشہ کی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ البتہ بلتستان قوم اور دور حاضر کے خاموش قلم کار جناب خان بنات گل خان آفریدی کے احسانات ہیں جنہوں نے (بلتستان ان ہسٹری) لکھ کر صرف بلتستان اور بلتستانی قوم کو دنیا کے آئینے میں واضح طور پر دکھایا۔ بنات گل خان صاحب نے اپنی کتاب میں بلتستانی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ جس کو پڑھ کر اب دنیا والے بلتی قوم اور بلتستان سے آشنا ہو رہے ہیں۔

اندرون بلتستان جن نوجوان قلمکاروں نے اللہ کا نام لیکر تاریخ نویسی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان میں 'بلتستان پر ایک نظر' کے خالق محمد یوسف حسین آبادی، بین الاقوامی شہرت یافتہ سرگرم محقق اور دانشور جناب سید محمد کاظمی، جناب محمد قاسم نسیم، محمد حسن حسرت، غلام حسن لوبسانگ وغیرہ نے بلتی قوم کی پیشانی سے ''گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا'' کا بدنما داغ دھونے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ ان کی تخلیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بلتی قوم کے نوجوان صرف تیر و تفنگ میں ہی نہیں بلکہ قرطاس و قلم کے بھی شہسوار ہیں۔ جناب بریگیڈیئر محمد ذاکر صاحب نے (سیاچن گلیشیر) کی کہانی لکھ کر بلتستان کی دفاعی صورت حال کی نقشہ کشی کی ابتداء کی ہے۔[1]

۱۔ صبا، راجہ محمد علی شاہ اماچا؛ نقیب آزادی، گیلانی پرنٹرز رابسن روڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۸۳، ۱۸۴

باب دوم

بلتی زبان کی ابتداء اور ارتقاء

بلتی زبان کی ابتداء اور ارتقاء

انسانی تہذیب کی طرح زبان کا ارتقاء بھی مرحلہ وار ہوتا ہے۔شروع میں یہ بولی(dialect) کی شکل میں ہوتی ہے۔باہمی میل جول اور سماجی زندگی سے اس میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔نئی اصطلاحات اور نئے محاورے بنتے ہیں۔ اس طرح بولی بتدریج نشوونما پاتی ہے اور زبان کا روپ اختیار کرتی ہے۔تمدن کی ترقی کے ساتھ لوک کہانیاں اور لوک گیت زبان کو مالا مال کرتے ہیں اور یہی لوک ادب زبان کی عوامی مقبولیت کا ضامن ہوتا ہے۔زبان کی اہمیت پر بلتی زبان میں ایک ضرب المثل ہے''پھیول جیر دنا پھسکد مرجید''یعنی انسان اپنے وطن کو بھول بھی سکتا ہے لیکن اپنی زبان کو نہیں بھول سکتا۔زبان تہذیب وثقافت کا ایک اہم ترین ورثہ ہے زبان انسان کا تشخص ہے۔

بلتی زبان کی ابتداء،نشوونما اور ارتقاء کی یہی کہانی ہے۔ایک عام بولی سے یہ ادبی زبان بنی ہے۔کشمیر،وسط ایشیا اور مغل حکومت سے تعلقات کی وجہ سے یہ فارسی اور اردو سے آشنا ہوئی۔جن کا اثر بلتی زبان وادب پر نمایاں ہے۔

بلتی زبان لداخ و بلتستان کے علاوہ ریاست اتراکھنڈ کے کالسی گیٹ، ہماچل پردیش کے لاہول اور سپتی، نیپال کے مستانگ اور کشمیر کے ترال میں بھی بولی جاتی ہے۔

بلتی زبان کے آغاز کے بارے میں عمومی طور پر دو نظریئے ہیں۔پہلا نظریہ یہ ہے کہ یہ تبّتی زبان کی دین ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بلتی زبان اپنے خطے میں تبت سے تعلقات اور میل جول سے پہلے مروج تھی۔تاہم محققوں میں اس بات پر متفقہ رائے ہے کہ تبّتی زبان نے بلتی کو رسم الخط دیا اور اس کو فروغ دیا۔لداخ اور بلتستان کے ہمسایہ ملکوں اور علاقوں کے علاوہ لداخ آنے والے تاجروں،مبلغوں،حملہ آوروں اور نوآبادکاروں کی زبانوں اور بولیوں نے بلتی زبان پر اثر ڈالا ہے اور اس کے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔

بلتستان میں بولی جانے والی زبان کو بلتی کہتے ہیں۔یہاں بسنے والے لوگوں کو بھی بلتی کہتے ہیں۔عمومی طور پر دنیا میں جتنی بھی زبانیں ہیں ان کے نام علاقائی اور نسلی آبادی کی مناسبت سے رکھے جاتے ہیں۔جیسے تبت میں بولی جانے والی زبان کو تبّتی، پرگ (کرگل) میں بولی جانے والی زبان کو پرگی اور شین (درد) والوں کی زبان کو شینا کہا جاتا ہے۔

بلتی زبان سائینو۔تبّتی۔تبتو۔برمن کی ایک شاخ ہے۔یہ زبان گلگت بلتستان،کرگل،نوبراہ،کشمیر کے ترال،مسوری،کالسی گیٹ،نیپال کے کچھ علاقے اور چین کے مستانگ میں بولی جاتی ہے۔اس زبان کا خاندانی رشتہ۔چینی،تبّتی۔تبّتی،کنوری۔بدی زبانیں،تبّتی زبانیں،لداخی،بلتی،بلتی سے ہے۔

کسی خطہ کے جغرافیائی حالات زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔باہمی رابطہ نہ ہو تو زبان بھی محدود ہو کر رہ جاتی

ہے۔دنیا میں بہت ساری بولیاں اور زبانیں ہیں ۔جن کے بولنے والوں کی تعداد سینکڑوں یا چند ہزار تک محدود ہے ۔کچھ زبانیں اور بولیاں امتداد زمانہ کے ساتھ معدوم ہوگئی ہیں یا معدوم ہو رہی ہیں ۔بلتی زبان کی بقاء اور فروغ کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فاتح حکمرانوں نے فتوحات کے بعد یہ زبان مفتوحہ علاقوں تک پہنچائی اور اسے مروج کیا۔اس طرح یہ لاہول سپتی (ہماچل پردیش) مستانگ (نیپال) تک پہنچی۔

لداخی محقق سونم پونچوک لکھتے ہیں۔

’’بلتستان اور پوریگ کی مقامی زبان ’’بلتی‘‘ کہلاتی ہے۔جو تبّتی زبان کی ایک شاخ ہے۔یہ زبان بلتستان کے علاوہ بھوٹان،سکم، نیپال کے شیرپا علاقوں،لداخ،تبت، ہماچل کے کلو منالی،لاہول ،سپتی،کنور ’’kinnoor‘‘ چین کے صوبہ گانسو۔یونان ’’Yunnan‘‘ سچھون ’’Sichun‘‘ چنگائی ’’Qinghai‘‘ میں معمولی فرق کے ساتھ بولی جاتی ہے۔بلتی میں ترکی زبان کے متعدد الفاظ مستعمل ہیں ۔ترکی میں باپ کو ’’اتا‘‘ کہتے ہیں بلتستان اور پریگ میں بھی یہی لفظ رائج ہے۔ یہاں سید اور چو خاندان کے گھرانوں میں ادب کے طور پر باپ کو ’’بابا‘‘ کہتے ہیں اور یہی لفظ ترکی میں بھی مروج ہے‘‘۔۱

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان اور لداخ میں رہنے والے اکثر لوگ منگول نسل سے ہیں منگول تبت سے ہوتے ہوئے لداخ اور بلتستان میں وارد ہوئے۔

بلتستان میں بسنے والا سب سے قدیم اور اکثر تبّتی نسلی گروہ منگول ہے۔چینی تاریخ میں قدیم تبّتی زبان بولنے والے اس نسل گروہ کو تنگوت یا زیزیا کہتے ہیں ۔جس کی کل آبادی ۷۰ فیصد ہے۔انہیں بلتستان کا ابتدائی آباد کار بتایا جاتا ہے۔ان کو منگول کی ذیلی شاخ ’’تبّتی‘‘ میں رکھا جاتا ہے۔یہ نسل پورے علاقے میں پائی جاتی ہے۔منگول ہوتے ہوئے بھی ان کی اکثریت آبادی جسمانی لحاظ سے تبت اور لداخ والوں سے مختلف ہیں ۔یہ فرق جغرافیائی آب وہوا اور مذہبی تفاوت کی وجہ سے ہے۔قبل از اسلام یہ تبت کے ادبی ،ثقافتی رسوم ورواج پر عمل پیرا تھے۔چنانچہ تبت کا اثر لداخی اور بلتی تہذیب وثقافت پر پڑنا ناگزیر تھا۔

عہد حاضر کی لداخی نسل بحیثیت مجموعی تین بڑی قوموں یعنی مون ،منگول اور آریہ قوموں کے نسلی اختلاط سے معرض وجود میں آئی ہے۔جو قدیم زمانوں میں براعظم ایشیا کے مختلف خطوں سے ہو کر لداخ میں وارد ہوئی تھیں ۔جن کا تعلق مختلف تہذیبوں سے تھا۔اس لیے فطری طور پر یہاں کی تہذیب وتمدن مختلف تہذیبوں کا عطرِ مجموعہ ہے جن میں مذکورہ نسلی تہذیبوں کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں ۔لداخ وبلتستان پر تبّتی اثرات جغرافیائی،تاریخی، مذہبی اور آریائی تہذیب

۱۔لداخ کی کہانی، جید پریس،بلیماران دہلی، ص:۱۴۵

کے حوالے سے دیکھے جا سکتے ہیں، جن کا ذیل میں مذکور ہے۔

جغرافیائی رشتہ:۔لداخ پہلے پہل تبت کا حصہ تھا۔ جو وسعت میں برصغیر ہندو پاک کے برابر تھا۔ جہاں تک اس کی تہذیب وتمدن پر طبعی ماحول کے اثر کا تعلق ہے، وہ تبت اصلی سے مختلف نہیں ہے۔البتہ امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں ردو بدل ہوتا رہا ہے۔ تبت اصلی کے طبعی ماحول کے نمایاں خدوحال اس کے فلک بوس پہاڑ، برف پوش چوٹیاں، ذخار دریا، ندی، نالے ،چشمے، جھلیں اور آبشاریں گرم چشمے، دشوار گذار راستے ،اور سرمائی بستیاں (ڈوق اور مل) جہاں تہاں سرسبز وادیاں ،اونچے پہاڑوں میں کہیں کہیں جڑی بوٹیوں، پھولوں اور جھاڑیوں کے تختے اوران میں پلنے والے جنگلی جانور، درندے، چرندو پرنداورسب سے بڑھ کراس کی بلندیاں اور پستیاں ہیں جنہیں آب وہوا کی سختی، سطح سمندر سے اونچائی ، برف باری کی بہتبنا کیوں اور آمد و رفت کی دقتوں نے اور بھی پر اسرار اور دلکش بنا رکھا ہے۔ یہ تما قدرتی مناظر اور جغرافیائی ماحول آج کے لداخ اور بلتستان میں بھی نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ ہمالیہ کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تبت بلتستان اور لداخ میں جغرافیائی مناسبت پائی جاتی ہے۔ بلندی پر پکنے والے اجناس گیہوں ،جَو، گرم اور مٹر کے لہلہاتے کھیت، نشیبی علاقوں، پھل اور پھلدار درختوں، پھول اور سبزیوں کے بے ترتیب باغ، اکثر و بیشتر علاقوں میں ایندھن اور اجناس کی عام قلت ،حصول معاش کے لیے سخت جسمانی محنت وریاضت میں بھی ان میں یگانگت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جغرافیائی عوامل کے جو اثرات تبّتی تہذیب وتمدن پر مرتب ہوئے، وہ لداخی اور بلتستانی تہذیب وثقافت پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔اس طرح ان میں قریب قریب ایک مشترکہ طرزِ زندگی وجود میں آئی۔ جو جغرافیائی ماحول اور فضا کی ہی دین ہے۔ جسے رنگ ونسل اور زبان کی وحدت نے اور بھی مستحکم اور ہم آہنگ کر دیا ہے۔

تاریخی رشتے:۔سکید ے نیا گون (۹۰۰ء) کے زمانے میں لداخ سلطنت تبت کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ نیا گون نے مغربی تبت بشمول لداخ میں ایک الگ خود مختار حکومت قائم کی۔عمر کے آخری ایام میں انھوں نے اسے اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ زنسکار ولداخ بڑے بیٹے سپلگی گون کے حصے میں آیا اور ڈوگرہ لداخ گیاپوان کے قبضے میں رہا۔ نیا گون کا تعلق تبت کے شاہی خاندان سے تھا جس کا بانی نیاٹھی چھن پو (پانچویں صدی قبل مسیح) تھا۔ گیاپوان لداخ گویا نیاٹھی چھن پو کی اولاد سے تھے اور تبّتی تہذیب سے انہیں انسیت تھی۔ یہاں تک کہ وہ امور سلطنت میں سابق شاہانِ تبت کا تتبع کرنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔تبت سے متعلق اسی قسم کے والہانہ جذبات ان کی تبّتی الاصل رعایا بھی رکھتی تھی۔اسی طرح ناری کورسوم (پورانگ۔کوگے وغیرہ) جو نیا گون سے پہلے لداخ کی طرح سلطنت تبت کا حصہ تھا اور جہاں سپلگی گون کے

چھوٹے بھائی الدے سوگ گون کا خاندان (شاہان کوگے) مدتوں گیا پوانِ لداخ کے تابع تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں ملکوں کے درمیان دوبارہ سفارتی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ اور پھر اٹھارھویں صدی عیسوی میں تبتِ اصلی میں بودھی روحانی پیشوا دلائی لاما[1] کا اقتدار قائم ہوا اس نے تعلقات میں اور بھی استواری پیدا کی اور دونوں ملک ایک دوسرے کی فنی تخلیقی اور تنظیمی صلاحیتوں اور مذہبی تحریکوں سے باقاعدہ استفادہ کرنے لگے۔

شاہان تبت جاہ وحشمت، حب الوطنی، ذوق جمالیات اور دینی امور سے دل چسپی کے لیے مشہور ومقبول تھے۔ علمائے دین کی قدر ومنزلت، دینی اداروں کی کفالت اور ملکی امور میں گہری دل چسپی لینا ان کا خاص شیوہ تھا۔ یہ انہی کی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ تبت میں بدھ ازم کا فروغ وسیع پیمانے پر ممکن ہوا۔ اور ہندوستانی علماء ومشاہیر کی نگاہیں تبت کی طرف مرتکز ہوئیں۔ اس بنا پر سماجی اور مذہبی اصلاح کی مہم کا آغاز ہوا۔ ان کارناموں پر اہل تبت کو بجا طور پر فخر وناز تھا۔ تبت کے روحانی شعر خصوصاً ملارسپا نے اپنی منظوم تخلیقات کے ذریعے مذہبی اور اخلاقی میدانوں میں ہلچل مچادی۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس کے لیے مذہب کا سمجھنا آسان ہوگیا اور عوام میں بہت حد تک اخلاقی پاکیزگی آگئی۔ جس نے ادب عالیہ اور عوامی ادب دونوں کو یکساں متاثر کیا۔ عوامی ادب مذہبی اور اخلاقی موضوعات ومضامین سے مالا مال ہوا اور اس کا اثر لداخ تک پہنچا۔ چنانچہ لداخی لوک گیتوں میں جو معنی ومفہوم کی تہہ داری، پس منظر کی گہرائی اور روحانیت کی چھاپ ملتی ہے وہ اسی تحریک کا بین ثبوت ہے۔

ا۔ تبت میں بدھ مت کا سردار کاہن جو خدا کا مجسم اوتار خیال کیا جاتا ہے۔ جب کوئی لاما فوت ہونے لگتا ہے تو وہ اپنی وفات سے قبل یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ اپنے آئندہ جنم میں کس گھرانے میں پیدا ہوگا۔ ان ہدایات کے پیش نظر اہل تبت بیان کردہ خاندان کے نوزائد فرد کو دلائی لاما کی مسند اقتدار پر بٹھاتے ہیں۔ جب چین نے تبت پر قبضہ کیا تو دلائی لامہ ہندوستان میں آکر پناہ گزیں ہوئے۔ البتہ ایک دوسرا مذہبی پیشوا پنچن لاما وہیں ہے۔ (وکیپڈیا)

<u>دلائی لاما</u>:۔ دلائی لاما ایک منگولی عہدہ ہے جس کا مطلب ہے علم کا سمندر اور دلائی لاما کو رحمت وشفقت کے بدھ الوکیتیشور کی خصوصیات رکھنے والے بدھا کے طور پر مانا جاتا ہے۔ بودھی ستوا ایسے صاحب علم لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے نروان کو ٹال دیا ہو اور انسانیت کی حفاظت کے لئے دوبارہ جنم لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ ان کو احتراماً پرم پاون (پاکیزگی والا) بھی کہا جاتا ہے۔ (وکیپڈیا)

کاچو سکندر خان سکندؔر صاحب نے تبت کے روحانی پیشوا دلائی لاما کو بطور سیاسی پیشوا کی تاریخ اٹھارہ ویں صدی رقم کی ہے جب کہ مورخوں نے لکھا ہے کہ تبت کے پانچویں دلائی لاما کے دوران تبت کے اندر سیاسی ہل چل ہو رہی تھی تب سے دلائی لامہ مذہبی پیشوا کے علاوہ سیاسی پیشوا کے طور پر بھی مانا گیا۔ اسے نیگونگ لوبسنگ کا نام دیا گیا، نیگونگ گستاؤ کو بطور دلائی لاما اس وقت نامزد کیا گیا جب تبت میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی نیگونگ ۱۶۴۵ء میں تبت کے سیاسی رہنما اور روحانی پیشوا کے طور پر سامنے آئے انہوں نے اعلیٰ حکام کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ملکی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم صادر کیا۔ (وکیپڈیا)۔ تبت کا پہلا دلائی لاما پندرہ ویں صدی عیسوی میں بنا۔ اب چودھواں سلسلہ چل رہا ہے۔ ان کا نام نامی جامفل ناونگ لبسنگ یشے تنزن گیاژو ہے۔

مذہبی تعلق کا اثر:۔

لداخی تہذیب پر تبت کے مذہبی رشتے کا سب سے زیادہ اثر ورسوخ رہا ہے۔ بدھ ازم کے فروغ سے پہلے تبت ولداخ سمیت بہت سے ملکوں کا مذہب بون مت تھا۔ اس مذہب کے بانی شین رب می وو غالباً کوگے کے باشندے تھے۔ اس لیے اس مذہب کا پھیلاؤ تبت سے شروع ہوا۔ اس مذہب کے پیرو دیوی دیوتاؤں اور مظاہر قدرت وفطرت کی پرستش کرتے تھے۔ اس کے بنیادی اصول مذہبی کتابوں اور تحریروں کے علاوہ مقامی قصے، کہانیوں اور گیتوں میں بھی مذکور ہیں جن میں رزمیہ (کیسر ساگا) اہم ترین مجموعہ ہے۔ کیسر ساگا کا مذہب بون چھوس بتایا جاتا ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بون مت کا دوسرا نام 'بون چھوس' ہے۔ کیسر ساگا کو اس مذہب کا آئینہ دار کہا جاتا ہے۔ جس میں قدیم تبتی تہذیب کی کامیاب مرقع کشی کی گئی ہے۔ کیسر ساگا اس زمانے کی داستان ہے جب تبت میں بون مت اپنے عروج پر تھا۔ چنانچہ ایک ادبی شاہکار ہونے کے علاوہ یہ بون مت کے پیروؤں کے لیے ایک مبسوط اور منظّم ضابطہ اخلاق بھی ہے

غالباً چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں تبت میں بون مت زوال پذیر ہوا اور اس کی جگہ بدھ مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس مذہبی انقلاب کا نتیجہ بھی لداخی تہذیب خصوصاً لداخی لوک ادب کے حق میں نیک فال ثابت ہوا۔ کیوں کہ رزمیہ اور دیگر دیومالائی عناصر جو بون مت سے پہلے یہاں موجود اور رائج تھیں وہیں اس میں مزید اضافہ ہوا۔ اس بنا پر بلتی زبان وادب میں وسعت پیدا ہوئی۔

آریائی تہذیب کے اثرات:۔ آریہ نسل کا لداخ (لداخ خاص، پرگ، بلتستان، زانسکار) میں پہنچ کر انہیں تبتیوں یعنی تبّتی نسل کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ تبتیوں کی تعداد شروع میں بہت کم تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بہت بڑھ گئی اور قوت و اقتدار میں وہ آریوں پر سبقت لے گئے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ رفتہ رفتہ آریائی تہذیب، تبّتی تہذیب سے متاثر ہوئی۔ آریہ نسل کے دَرد اکثریتی فرقے میں گھل مل گئے۔ اس صورت حال نے دونوں قوموں کے نسلی امتزاج کے لیے راہ ہموار کی۔ اور ایک نئی نسل یعنی موجودہ نسل اور نئی مخلوط تہذیب وجود میں آئی جس میں تبّتی رنگ وبو زیادہ غالب ہے۔

اس نئے معاشرتی ربط وارتباط نے علم وفن اور زبان وادب پر دوررس اثرات ثبت کئے مثلاً زبان اور رسم الخط وغیرہ پر اس کا واضح اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ قدیم بلتی رسم الخط تبتیوں کا عطا کردہ تھا۔ جب کہ باقی لوازمات میں آریوں کا بھی حصہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایک عمارت اٹھی جو ساخت کے اعتبار سے تبّتی اور سامانِ

آرائش وآسائش اور رنگ وروغن کے لحاظ سے آریائی تھی۔ چنانچہ موجودہ لداخی تہذیب اور خالص تبّتی تہذیب کے درمیان جومغائرت اوراختلاف کامہین پردہ نظرآتا ہے، وہ اسی آریائی عنصر کی کارفرمائی ہے۔

جہاں تک زبان کاتعلق ہے۔آریوں نے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا اورلہجہ کومتاثر کیا۔ساخت اس کی تبّتی ہی رہی۔البتہ رسم ورواج، پیشوں ،تہواروں ،کھیل تماشوں ،عوامی ادب (گیتوں، قصے کہانیوں، دیو مالاؤں وغیرہ)اور مذہبی عقائد کی ترویج میں آریہ تبتیوں کے شانہ بشانہ چلے۔اور بعد میں جب، جیسے اور جہاں موقع ملا اپنی آبائی چیزوں کو آگے بڑھایا۔اس حقیقت کا انکشاف لداخ اور بلتستان (جہاں مخلوط نسل کی اکثریت رہی ہے) کی قومی روایات ،رسم و رواج اورلوک ادب سے ہوتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ وجوہات کی بنیاد پرلداخ میں مون ابتدا سے نیچ ذات سمجھے جاتے تھے۔انہیں گلوکاری اور موسیقاری کا کام سونپا گیااوروہ رفتہ رفتہ پیشہ ورسازندے کےطور پران کی الگ شناخت قائم ہوئی۔اوران سے قومی سطح پرگانے بجانے کا کام لیا گیا۔میلوں ،تہواروں ،شادی اور ناچ رنگ کی تقریبات میں مون کی موجودگی لازمی سمجھی جانے لگی۔اس امتیاز کی ابتدا تبّتی نسل کےلوگوں سے ہوئی۔بعد کے زمانوں میں دردموسیقاراور گویے بھی 'مون' نام سے یاد کیے جانے لگے۔مونوں نے لداخی موسیقی کوایک فن کی حیثیت سے ترقی دی اوراس کی روایات کوزندہ رکھا۔تبّتی آلات موسیقی میں دف،ستار،طنبورہ، رگیالنگ اورمرلی شامل تھے۔دردوں نے ان میں ڈھول، دمامہ اورسرنائی کا اضافہ کیا اور مونوں نے ان سب آلات کے استعمال میں کمال حاصل کیا۔یہ چیزیں موجودہ معاشرہ میں قدیم مونوں کی یادگار ہیں۔اس کے علاوہ ان کی آبائی تہذیب نے بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔جن میں مون سکت (سکد)یعنی قدیم مونوں کی زبان کے بچے کھچے الفاظ اورمحاورے بھی شامل ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں بلتستان و پریگ میں تبلیغ اسلام کا آغاز ہوا۔تھوڑے ہی عرصے میں بلتستان کی تمام اور پریگ کی نصف سے زیادہ آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی۔اس مذہبی انقلاب کا اثران علاقوں کی سیاسی ،تہذیبی اورسماجی زندگی پر پڑا۔عوام اورخواص کی اکثریت اسلامی تہذیب اورطرزفکر سے متاثر ہوئی۔ پرانی تہذیبی قدریں بدلنےلگیں، بہت سے پرانے رسم ورواج اور پرانے میلے ٹھیلے متروک ہوئے مذہبی امور میں اب تبت ولداخ کے بجائے عرب، ایران اورکشمیر سے رجوع کیا جانے لگا۔بلتستان میں فکروفن کی سطح پر بدلاؤ آیا۔اب یہاں فارسی اورعربی ادب متعارف ہوا۔اس کا اثر مقامی زبان پر پڑااوراس میں فارسی طرز کی شاعری کا آغاز ہوا۔اسی طرح دیگرفنون لطیفہ میں بھی تبدیلی آئی اورخصوصاً فن تعمیر زیادہ متاثر ہوا۔تبّتی طرز کے گنپوں، مانیوں اور چھورتنوں کی جگہ عراقی اورایرانی طرز کی مسجدوں، خانقاہوں، امام

باڑوں اور میناروں نے لے لی۔اس حوالے سے فدا حسین رقم طراز ہیں:۔

''اس پورے علاقے بلتستان میں بدھ مت کے پیروکار آباد تھے۔ان کے عقائد،ان کی زبان اور تمدن ومعاشرے پر تبت کی حاکمیت مسلط تھی۔اس بات کا کوئی مسلمہ ثبوت نہیں ہے کہ اس زبان کا نام ''اگیہ'' تھا گو کہ بلتستان کے بعض دانشوروں کا خیال ہے بلکہ ان کی تحقیق ہوگی کہ یہی بلتی زبان ''اگیہ'' تھی اور موجودہ بلتی زبان اس ''اگیہ'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔مسٹر ایچ اے جشکے نے جو برطانوی ہند لاھول کے کیلانگ ضلع میں موراوین (Moravian) مشنری کی طرف سے بطور پادری مامور تھے۔''ایک ڈکشنری تبّتی۔انگریزی لغت A TIBETAN - ENGLISH DICTIONARY'' کے نام سے مرتب کی اس میں ''اگیہ'' زبان کے نام سے کوئی لفظ موجود نہیں ہے بلکہ تبّتی زبان لکھا گیا ہے۔بہر حال ''اگیہ'' یا ''تبّتی'' تبت خورد میں اس وقت متاثر ہوئی جب یہاں دین اسلام کے مبلغین اور ہادیان دین مبین نے عربی اور فارسی کتب کی درس وتدریس کا نورانی دریا بہایا۔اور اس کی زد میں آکر ''بون مت'' اور ''بدھ مت'' کے عقائد کے ساتھ ساتھ تبت کے لسانی مذہبی ذخائر بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔تبت خورد یعنی زانسکار۔کرگل اور بلتستان تبّتی زبان کے حلقہ اثر سے نکل گیا۔اس زبان پر عربی اور فارسی زبان نے غلبہ حاصل کیا اور ایک نئی تہذیب وثقافت اور ایک نئے معاشرتی ڈھانچے نے جنم لیا۔بلتستان میں بلتی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور اس رسم الخط میں فقہ کی کتابیں،درسی کتب،جنگی کارنامے اور اردو وظائف،حمد ونعت،حضرات معصومین کے قصائد اور مرثیے،تاریخی واقعات،نثر ونظم میں منضبط ہوئے۔شعروشاعری کا ایک بیش بہا سرمایہ اس رسم الخط میں موجود ہے''۔[1]

بلتی مورخ یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں:

''تبّتی تحریری زبان کا ارتقائی دور ساتویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف سے شروع ہوتا ہے۔تبت کے بادشاہ سرونگ تسان گمپو (۵۰۔۶۱۷ء) نے اپنے انو نامی وزیر کو جس کا تعلق تھونمے قبیلے سے تھا اور جو بعد میں تھونمی سامبھوتہ کے نام سے بھی معروف ہوا،اپنے بیٹے اور شاگردوں کی ایک ٹیم کے ساتھ ۶۳۲ء میں ہندوستان بھیج دیا تاکہ فن تحریر کا مطالعہ کرے۔ادھر سنسکرت زبان وعلوم کے مطالعے کے بعد تھونمی سامبھوتہ نے تبّتی زبان کے لئے اس کے تقاضوں کے مطابق ایک رسم الخط ایجاد کیا جو تیس حروف اور چار اعرابی علامات پر مشتمل تھا۔اس نے پہلی بار تبّتی میں گرائمر بھی لکھی جو ۶۵۳ء میں مکمل ہوئی۔اس کے اس کارنامے کے ساتھ ہی سنسکرت سے مذہبی کتابوں کا تبّتی میں ترجمہ ہونے لگا۔مذہبی تاریخ،شاہی خاندان کی تاریخ اور نسب نامے بھی زیر تحریر آئے۔غنائیہ شاعری کے علاوہ افسانے اور کہانیاں بھی مدون ہوگئیں۔ان کہانیوں میں کیسر کی کہانی بھی

۱۔غاسنگی،فدا حسین؛بلتی گرائمر اور بول چال،سودے بکس لنگ روڈ،سکردو،ص:۵

شامل تھی۔کیسر تبت کی قرون وسطی کی رزمیہ شاعری کا ہیرو تھا۔کیسر کی بارہ ابواب پر مشتمل کہانی بلتستان (لداخ) میں اس وقت بھی مقبول عام ہے۔ا

زبانیں اور ان کے رسم الخط تہذیب وثقافت میں ہونے والے تغیر کے مطابق بدلتے ہیں۔حکومت کی پسند و ناپسند اور مزاج کے مطابق لوگوں کا رویہ بھی بدلتا ہے۔ہمارے ملک کی بات کریں تو انگریزوں کی آمد کے بعد جب ان کی حکومت قائم ہوئی تو لوگ ان کی تہذیب کو اپنانے لگے۔موجودہ دور میں ہمارے یہاں ہر زبان کا ایک مستقل رسم الخط ہونے کے باوجود رومن میں ہی لکھنا اچھا سمجھا جا رہا ہے۔ہندی یا اردو بولنے والوں کے اپنے اپنے رسم الخط موجود ہیں لیکن آجکل اکثر لوگ ہندی یا اردو کو رومن میں ہی لکھتے نظر آتے ہیں۔انگریزوں سے پہلے جب ملک میں مغلوں کا دور دورہ تھا تب مسلم ہو یا غیر مسلم، چاہیں یا نہ چاہیں فارسی زبان ہی بولتے یا لکھتے تھے۔ویسے ہی لداخ اور بلتستان میں جب تبتیوں کی حکومت تھی تب یہاں بھی تبّتی رسوم ورواج کو ہی اولیت کا درجہ حاصل تھا۔رفتہ رفتہ لداخ اور بلتستان میں الگ الگ حکومتیں قائم ہوئیں۔سیاسی اور مذہبی طور پر انقلابات بھی آتے رہے۔بون مت اور بودھ مت کے پھیلاؤ کے بعد اسلامی تہذیب کو اپنانے،ان کے طور طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔جس کی وجہ سے لداخ اور بلتستان میں اپنی تہذیب اور ثقافت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔زبان کے لحاظ سے تبّتی رسم الخط کو ترک کر کے فارسی رسم الخط کو اپنایا گیا اور فارسی رسم الخط میں کچھ اور حروف کا اضافہ کیا گیا تا کہ حروف کا تلفظ جو فارسی حروف تہجی کے ذریعے ادا نہیں ہو رہا تھا وہ صحیح طور پر ادا ہو سکے۔

بلتی حروف تہجی:

مفرد حروف:۔ا ب پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج چ چھ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ ژھ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک کھ گ کء ل م ن ں و ہ ی ے۔

مرکب حروف:۔سپ تر ست ھل خل در رب بر بڑ زب لز ہرژ ژھ سک زگ رگ سن۔

فارسی سے ماخوذ حروف تہجی:۔ا ب پ ت ث ج چ ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ ی ے۔

ا۔تاریخ بلتستان،ص:۳۱۷

سنسکرت یا ہندی سے ماخذ حروف تہجی:۔

پھ تھ ٹ ٹھ ڈ ڑ ژ ژھ جھ چھ کھ لھ۔

چند بلتی حروف تہجی:

ج چ چھ ر ش گ ن کھ ن

چند بلتی حروف کی وضاحت از ماہر لسان جناب فدا حسین کی زبانی:

ج: فارسی حرف ''ژ'' کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً جربا (اندھا، نابینا)

چ: حرف ''چ'' سے ہلکی آواز مثلا۔ چو (گندم) چوژوس (گال)

ز: حرف ''ر'' اور ''ز'' کی درمیانی آواز دیتی ہے۔ مثلاً

زاؤ، زاؤ (شوروغوغا) زونمہ (سوار ہونا)

ش: حرف س اور ش کی مخلوط آواز نکالتا ہے۔ مثلاً

شنگ شنگ (پھیکا پن، گالی یا نازیبا الفاظ)

گ: حرف ''گ'' اور ''ر'' کی مخلوط آواز ہے۔ مثلا

چھری لیگس (برابر آنا، فٹ آنا)

ن: اردو نون غنہ کی آواز ہے۔ مثلاً

ہرکیان (حرف)

چھ: حرف چ اور ھ کی مخلوط آواز۔ اس کا تلفظ یوں ہوتا ہے۔ چھ (چیل، باز) چھرب (زرہ)

ن: یہ ہرکیان (حرف) کسی لفظ کی ابتداء میں نہیں آتا۔ بلکہ لفظ کے درمیان یا آخر میں آتا ہے۔ مثلاً

مونپہ (بادل) غونی (برا، خراب، بدنصیب)

ادائیگی تلفظ (زیر بزونگ) **ادائیگی تلفظ (زیر بزونگ)**

حروف	تلفظ	حروف	تلفظ
ا	الف	ب	با
پ	پا	پھ	پھا
ت	تا	ت	تھا

ٹ	ٹا	ٹھ	ٹھا
ث	ثا	ج	جیم
ج	جیم	چ	چا
چھ	چھا	چ	چا
چھ	چھا	ح	حا
خ	خا	د	دال
ڈ	ڈال	ذ	ذال
ر	را	ڑ	ڑا
ز	زا	ز	زا
ژ	ژا	ژھ	ژھا
س	سا۔سین	ش	شین
ش	شین	ص	صاد
ض	ضاد	ط	طا
ظ	ظا	ع	عین
غ	غین	ف(پھ)	فا(پھا)
ق	قاف	ک	کاف
کھ	کھاف	گ	گاف
ک	کاف	ل	لام
م	میم	ن	نون
ن	نونگ(نون غنہ)	ن	نونڈ
و	وا	ہ	ہا
ی	ی	ے	ے

کول بزونگ

بلتی حروف تہجی	بلتی الفاظ	معنی (اردو)
ا	اللہ	خدا
ب	ببا	باپ
پ	پپا	کھانے کا ایک قسم
سپ	سپلبا	ماتھا
ت	تومار	زیور
تر	ترونمو	گرم
ست	سترگہ	اخروٹ
تھ	تھانگچو	گوند
ٹ	ٹاکوشو	آڑو
ٹھ	ٹھوب	اندھیرا
ج	جندا	جیب
ج	جین ما	گردن
چ	چولی	خوبانی
چھ	چھومیک	چشمہ
ح	حکیم	ڈاکٹر
ھ	ھبو	کیڑا
ھل	ھلم	پاپوش
خ	خلونگ	ہوا
خل	خلانگ	بیل
د	داخون	چادر
در	درینمو	چادر

ڈ	ڈونگ ڈونگ	اونچا
ذ	ذمبہ	پل
ر	ربق	بکری
رب	ربا	خیمہ
بر	بروک	گرج
ڑ	ڑونمہ	مارنا
بڑ	بڑے	پیمانہ
ز	زچس	طعام
لز	لزا	مہینہ
ژ	ژونگ	پیاز
ژھ	ژھر	ؓباغ
ہرژ	ہرژوا	گھاس
س	سہ مار	مٹی کا تیل
ش	شا	گوشت
ش	شڑا	شاخ
ص	صندوق	صندوق
ض	ضوا	ڈول
ط	طبق	تھالی
ظ	ظلم	ظلم
ع	عجب	حیران
غ	غبول	سانپ
ف	فروغ	کوا
فرا	فراغون	چمچہ

ق	قار	لوئی
ک	کورام	گڑ
سک	سکمبو	خشک
کھ	کھرا	چینی
گ	گونمو	قمیص
زگ	زگو	دروازہ
ل	لقپا	ہاتھ
م	مار	تیل
ن	نورو	نیک
سن	سنا	کان
ن	نیما	دھوپ،سورج
سن	سنامو	اونٹ
نگ	ننگ	مکان
و	وا	لومڑی
ی	یوہا	اژدھا
ے	یور	طمع،لالچ

تبت فاؤنڈیشن،لندن کی ایک بنیادی کتاب جوتبّتی بلتی سیکھنے والوں کے لئے مرتب کی گئی ہے۔اس میں لکھا گیا ہے:

''ہماری زبان بلتی دراصل تبّتی زبان کی ایک شاخ ہے جو دنیا کی چند خوبصورت میٹھی اورادبی زبانوں میں سے ایک ہے۔بلتی کی طرز تحریر یعنی رسم الخط کو اے گے کہتے ہیں۔یہ رسم الخط انگریزی اور چینی زبانوں کی طرح بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے''

آگے مزید لکھا ہے کہ:

''بلتی رسم الخط کے ہر حرف تہجی کے بائیں طرف ایک نقطہ یا اعشاریہ کا نشان لگانا ضروری ہوتا ہے۔جسے''ژھیک'' کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ چک چھد(!) نیس چھد(।।) اور بجی چھد(।।।।) ژھیک کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں۔جو بالترتیب لفظ یا

جملے کے اختتام، پیراگراف کے اختتام اور باب یا مضمون کے اختتام پر لکھے جاتے ہیں۔
بلتی تحریر کے کئی انداز ہیں۔جن میں بوچھن اور بومید قابل ذکر ہیں، ۔تمام کتابیں اور تصانیف اسی طرز (بوچھن) میں لکھی جاتی ہیں۔بلتی حروف کی کل تعداد تیس ہے۔اس کے علاوہ آٹھ حروف ایسے ہیں جن کا جو عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی ملاوٹ کی وجہ سے اضافہ کیا گیا ہے۔ان حروف کو خارجی حروف کہتے ہیں''۔

(بلتی۔تبتی سیکھنے کا قاعدہ۔تبت فاؤنڈیشن،لندن؛ص۔٦)

سن۸۴۲ء میں تبت کے بادشاہ لنگ ترما کے قتل کے بعد بلتستان سیاسی طور پر تبت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر ربع کے دوران یہاں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہاتھوں اشاعت اسلام کا آغاز ہوا اور سولہویں صدی کے اوائل تک سارا علاقہ اسلام سے فیضیاب ہوا۔اس کے ساتھ ہی بلتستان کا تبت کے ساتھ مذہبی و روحانی رابطہ منقطع ہو گیا۔اس سے قبل یہاں سے طلباء حصول علم کے لئے تبت کے مدارس تک جاتے اور اس تیس سالوں کی تحصیل کے بعد گیشے کی سند لیکر وطن واپس آتے تھے۔اس طرح تبت سے مذہبی اور روحانی الگاؤ نے لسانی تعلق کو بھی متاثر کیا۔یہیں سے بلتی زبان نے اپنے علیحدہ تشخص کا سفر شروع کیا۔اس سے قبل اس کا اپنا الگ ادبی سرمایہ موجود نہیں تھا۔

کوئی بھی چیز اپنی اصل جڑ سے جدا ہونے کے بعد مختلف مسائل کا شکار ہوتی ہی ہے۔بلتی زبان کی بھی یہی صورتحال ہوئی۔رسم الخط تو بلتی نے فارسی سے لے لیا لیکن بلتی کے کچھ الفاظ کی ادائیگی فارسی حروف تہجی سے نہیں ہو پا رہی تھی اس لئے ماہرین نے بلتی حروف تہجی میں کچھ حروف کا اضافہ کیا۔جیسے۔ج۔چ۔ز۔ش۔گ۔ن۔ن۔
یوں تو اولین بلتی حروف تہجی کو رائج کرنے والے کا نام حاتم خان بتایا جاتا ہے جو چپلو کے راجہ فتح علی خان کے دادا تھے۔ لیکن اس میں پورے بلتی زبان کے تلفظ والے حروف نہیں تھے۔ماہرین لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء میں محمد خلیل الرحمٰن نے بلتی کے لئے ایک قاعدہ مرتب کیا ہے۔جس میں بھی مکمل رسم الخط نہیں ہے۔
بلتی زبان کا اصلی رسم الخط بلتستان میں صدیوں کے بعد پہلی بار ۱۹۸۴ء میں ''بلتستان پر ایک نظر'' میں منظر عام پر آیا جو مقامی باشندوں کے لئے تب تک معمہ بنا ہوا تھا۔

۱۹۸۸ء میں یوسف صاحب نے قرآن مجید کے بلتی ترجمہ کے لئے کچھ حروف وضع کئے اسے ۱۹۹۰ء میں حلقہ علم وادب بلتستان کی میٹنگ میں بلتی زبان کے لئے معمولی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔نومبر ۱۹۹۰ میں 'بلتی زبان' کے عنوان سے بلتی زبان کے اصلی رسم الخط اور فارسی رسم الخط دونوں کا قاعدہ شائع ہوا۔

ستمبر ۲۰۰۱ء میں چار بلتی مصنفین کی ایک جماعت نے حاجی فدا محمد ناشاد ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو شمالی علاقہ جات کی سرپرستی میں اسی رسم الخط میں ایک تصویری بلتی قاعدہ مرتب کیا جسے پروفیسر فتح ملک صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے مئی ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہی افراد کی کوششوں سے اس رسم الخط کے تحت بلتی زبان کے لئے سافٹ ویئر بھی تیار کیا گیا۔

بلتی زبان کی لغت نویسی کے سیاق میں بات کی جائے تو سب سے پہلے آغا فضل علی شاہ کا نام لیا جاتا ہے۔ انہوں نے فارسی۔بلتی منظوم لغت تیار کی۔اسی دوران اے ایف سی ریڈ نے بلتی گرامر لکھی، اس کے آخر میں لگ بھگ دو ہزار الفاظ پر مشتمل انگریزی۔بلتی لغت بھی شامل ہے۔

ایک بلتی عالم شیخ احمد نے ۱۹۶۹ء میں ''معرفتہ المبتدئین'' کے عنوان سے ایک مختصر سی عربی۔فارسی بلتی لغت مرتب کر کے نجف اشرف عراق سے شایع کی۔بلتستان کے مشہور شاعر اجہ محمد علی شاہ صبا نے ''بلتی۔اردو لغت'' مرتب کی جسے بلتی زبان کی جامع ترین لغات میں شمار کیا گیا ہے۔ایف سی ریڈ نے بلتی زبان کی انگریزی میں گرامر لکھی جسے تھونے سامبھوتہ کے بعد بلتی زبان کا اولین گرامر قرار دیا گیا ہے۔اس زمانے میں اکثر انگریز عیسائی مذہب کی تبلیغ کی غرض سے لداخ اور بلتستان آتے رہتے تھے اسی غرض سے یہ کتاب یعنی بلتی گرامر لکھی گئی۔بلتی اسکالر غلام حسن صاحب نے ۱۹۹۱ء میں بلتی میں ہی بلتی گرامر لکھی۔۱۹۹۵ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں برن یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ نے شائع کیا۔۱۹۹۵ء میں ہی فدا حسین نے اردو میں بلتی زبان کی گرامر مرتب کی۔

یوسف حسین آبادی کے مطابق بلتی زبان میں نثر کی ابتدائی تحریروں میں عباس علی شاہ عباسؔ کی کتاب ''ماتمی شوقبو'' کو شمار کیا گیا ہے۔عیسائی مبلغین نے بلتی زبان میں ''کھوم لوکھسی لم'' یعنی راہ نجات کے عنوان سے متی کی انجیل مقدس کا ترجمہ کیا۔اس کتابچہ ''کھوم لوکھسی لم'' کے مصنف بھی عباس علی شاہ عباسؔ بتائے جاتے ہیں۔ماسٹر غلام عباس برونے ''زادالمذنبین'' اور آخوند یوسف ہرداس نے ''راہ نجات'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جو عقائد اور اعمال کے عنوانات پر مشتمل ہیں ان دونوں مصنفین کا تعلق پرگ (کرگل) سے ہے۔

شیخ جعفر مرحوم نے قرآن مجید کا بلتی ترجمہ ۱۹۶۹ء میں کیا تھا۔لیکن یہ شایع نہیں ہوسکا۔فدا حسین شمیم کی کتاب ''اصلاح معاشرہ'' کے عنوان ۱۹۸۷ء میں چھپی۔بلتی اقوال زرین کا ایک مجموعہ ''اوت'' کے عنوان سے ۱۹۹۲ میں بلتی ادیب جناب غلام حسن لوبسانگ نے لکھا۔یوسف حسین آبادی نے قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کیا۔اور اسے ۱۹۹۵ء میں شایع کیا گیا۔

بلتی ،بولی سے اٹھ کر جب ادبی زبان کے زمرے میں شامل ہوئی تو اس میں مختلف قسم کی اصناف بھی وجود میں آئیں۔جیسے داستان،افسانہ،ڈرامہ،غزل،قصیدہ،مرثیہ،بحرطویل وغیرہ۔اب یہ زبان روز بہ روترقی کررہی ہے۔

اب تک ہم بلتی زبان کے رسم الخط ،لغات،گرامر،اور بلتی ادیبوں اوراسکالروں کی تخلیقات پرمختصرطور پرتبصرہ اور تجزیہ کررہے تھے۔آنے والے ابواب میں بلتی اصناف کاتفصیلاً جائزہ لیاجائے گا۔

مورخین کے مطابق بلتستان کے علاوہ لداخ کے ضلع کرگل میں پرگ زبان رائج ہے،اس بارے میں ماہرین نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔

کے۔رنگن نے گیرسن کے حوالے سے لکھا ہے:۔

Grierson (1971:42-50)says that purik,according to the conception of Ladakhis extends from the zoji pass to Bhod-kharbu and that it is closely related to Balti and ladakhi and it can be treated as the connecting link between the two .this name is derived from the name of the place purik.(k, Rangan;CIIL,Mysore,570004.p.5)

The informants used for the collection of purik data are educated and working as a teachers in primary and secondary schools.They know both urdu and English in addition to purki and some of them know kashmiri too.The informants selected are not old and not free from the influence of other languages.More than 30 percent of words collected are borrowed from Urdu and little percentage of word from English.(k Rangan.CIIL, Mysore.570004.p.4)

پرگ زبان کی ابتدا (origin) کے بارے میں ماہرین لسانیات نے ذیل کا نقشہ دیا ہے۔

sino Tibetan

Tibeto Burman

Central

Western Tibeto Burman

Himalayan Bodic

Lepcha, Honpa, Newar, Old tibetan, Tamang

Sherpa, **purik**, Tibetan

لسانی شاخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرگی زبان کا تعلق سائنوتبت سے ہے۔ پریگ میں بولی جانے والی اس زبان کو پرگی سے موسوم کیا گیا ہے۔ پریگ اصل میں مرکب الفاظ پوت ریکس تھا۔ پوت بمعنی۔تبت اور ریکس بمعنی اصل، یعنی تبت الاصل، ماہرین کے مطابق یہ نام اس وقت رائج ہوا جب تبتیوں نے پریگ میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔

اب تک کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری جس میں پرگی زبان کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہو ماسوا پریگ سے تعلق رکھنے والے سکالر جناب عیسیٰ صابری کی تصنیف کے۔موصوف نے پرگی رسم الخط کے فائدے اور نقصانات کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ان کے مطابق پرگی کا پہلے کوئی اسکرپٹ نہیں تھا۔ کیونکہ دور راجگان میں عام لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی شاید چنداں بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مذہبی رسومات ادا کرنے کے لئے مذہبی رہنما یعنی 'لاما' موجود تھے۔اگر جائداد وغیرہ کی لین دین یا وراثت وغیرہ کے معاملات کو قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو سرکاری زبان یعنی ''پوادیگ'' میں ہی تحریر کیا جاتا تھا۔جس کے لئے باقاعدہ کسی بااختیار مذہبی یا سرکاری عہدے دار سے رجوع کیا جات تھا۔اشاعت اسلام کے بعد اسلامی دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح پریگ اور بلتستان میں بھی مدرسے قائم ہوئے جن میں عام لوگ تعلیم حاصل کرنے لگے اسی وجہ سے پریگ اور بلتستان میں تعلیم یافتہ لوگ اردو اور فارسی سے آشنا ہوئے۔اور فارسی اور اردو ادب کی تقلید میں اپنی اپنی زبانوں میں اشعار لکھنے لگے اس ضمن میں انہوں نے نستعلیق کو اپنایا جس سے وہ بخوبی واقف تھے۔عیسی صابری لکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں برسوں سے اسکالروں اور قلمکاروں میں یہ تصور کہ پریگ اور بلتستان والوں نے اپنی آبائی اسکرپٹ پوادیگ کو صرف مذہبی تعصب کی بنا پر صرف نظر کیا ہے۔ یہ ایک بالکل ہی غلط اور ناسمجھی پر مبنی تصور ہے۔اگر ہم تاریخ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام سے قبل صرف وہی لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے جو اپنے آپ کو مذہب کے لئے وقف کر کے 'گونپہ' میں قیام پذیر ہوتے تھے۔لاماؤں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ، امچی یعنی دواؤں کی تعلیم اور علم نجوم سکھایا جاتا تھا۔عام لوگوں کی کسی بھی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت

کے لئے جس میں لکھت پڑھت کی ضرورت ہوا نہی لوگوں سے رجوع کرنا ضروری تھا۔

اسلام کی اشاعت کے بعد چونکہ ہر آدمی کو قرآن کی تعلیم اور باقی مذہبی مسائل کی تعلیم کی طرف راغب کیا گیا اس لئے عام لوگ بھی پڑھنے لکھنے کے قابل ہو گئے۔ ظاہر ہے مدرسے میں فارسی، عربی اور اس کے بعد کے زمانے میں اردو پڑھائی جاتی تھی اس لئے لوگ ان زبانوں کی طرف زیادہ راغب ہوئے۔ الغرض پہلے بلتستانیوں نے فارسی ادب سے استفادہ کر کے اپنی زبان میں غزل، قصیدہ، نعت و منقبت، نوحے اور مرثیے لکھے اور اس طرح اپنی زبان میں ایک قابل قدر ادبی سرمایہ جمع کیا۔ مدتوں بعد پریگ میں بھی بلتستان کی دیکھا دیکھی یہی عمل شروع ہوا اور اب پریگ میں بھی علم و ادب کا گران قدر سرمایہ موجود ہے۔

ہم جب رسم الخط کی بات کرتے ہیں تو ہمیں حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ہم جذباتی ہو کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ بودیگ ہمارے آباواجداد کا ورثہ ہے اور اسے اپنانا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا بودیگ موجودہ پرگی کے تمام فنی، لسانی اور ادبی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے یا نہیں۔ ہمیں پہلے یہ تجزیہ کرنا چاہئے کہ پودایگ اور نستعلیق میں سے کون سا رسم الخط ہماری زبان پرگی کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ پودایگ کے حامی حضرات اس کے اپنانے کے لئے مندرجہ ذیل فائدے گنتے بتاتے ہیں۔

۱۔ پودایگ ایک تسلیم شدہ اسکرپٹ ہے۔

۲۔ اس اسکرپٹ کے اپنانے سے ہم اپنی زبان کے ماخذ یعنی چینی تبتی گروپ کی دوسری زبانوں اور بھاشاؤں سے قریب ہو سکتے ہیں اور ان کے ادب سے ہمیں فائدہ مل سکتا ہے۔

۳۔ ہماری بھاشا کی دوسری بہنیں لداخی اور تبتی دونوں پودایگ کی دین ہیں ان سے ہمیں فائدہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ پودایگ اسکرپٹ ہمالیائی خطے کے بہت سارے دوسرے علاقوں میں مروج ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پودایگ ہمالیائی خطے کے دوسرے علاقوں مثلاً بھوٹان اور سکم وغیرہ میں استعمال کی جاتی ہے اسے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہاں کی اور لداخ کی زبان مشترکہ ہے۔ زبانیں جدا ہیں، صرف اسکرپٹ مشترکہ ہے۔ ان تمام محاسن کے باوجود پودایگ کو پرگی اسکرپٹ کے طور پر اپنانے میں کئی خامیاں بھی ہیں۔ جن کی نشاندہی ضروری ہے۔

۱۔ پودایگ، پرگی کے تمام ہجوں اور آوازوں کے لئے ناکافی ہے۔ تمام عربی الاصل اور کئی فارسی الاصل الفاظ کا تلفظ پودایگ میں ممکن نہیں۔

۲۔اگر پودایگ کوبطوراسکرپٹ اپنائی جائے تو پرگی کے تمام پرانے ادبی ورثے کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔

یہ دوخامیاں ایسی ہیں جس سے دوسری خوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔اس لئے میری نظر میں نستعلیق یعنی اردوکواپنانا ہی ہماری زبان کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ اس سے جوفوائد ہوں گے وہ یہ ہیں۔

ا۔اردواسکرپٹ پوریگ میں تمام خواندہ اورنیم خواندہ لوگ پڑھ سکتے ہیں۔

۲۔اردواسکرپٹ طویل مدت سے پرگی تخلیقات کے لکھنے کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔اس لئے لوگ اس سے مانوس ہیں۔

۳۔نستعلیق میں بہترین اورخوبصورت خطاطی ہوسکتی ہے۔

جب نستعلیق کوہی پرگی اسکرپٹ مان لیناٹھہرا تو ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نستعلیق اپنی موجودہ صورت میں کئی خالص مقامی یا دقیق معنی میں خالص تبتّی آوازوں اورہجوں کی متحمل نہیں ہےاس لئےنستعلیق میں کچھ اضافہ ضروری ہے۔

یہاں پر پودایگ کے حامی یہ اعتراض اٹھائیں گے کہ جب اضافہ کرنا ہی ٹھہرا تو پودایگ بھی عربی الاصل الفاظ کی متحمل ہوسکتی ہے۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ پودایگ میں عربی الاصل آوازوں کے لئے نشانات کے اضافے کے بعد بھی کچھ ناگزیر کمیاں رہ جاتی ہیں۔مثلا پودایگ گرامر کے مطابق مختلف الفاظ لکھنے کے کچھ خاص اصول معین ہیں جن کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔زمانے کےتغیر کے ساتھ الفاظ کا تلفظ بدل گیا ہے جب کہ ان کے ہجےانہیں پرانے اصولوں پرمبنی ہیں جس سےانحراف گناہ سمجھا جاتا ہے۔

پودایگ حروف تہجی کی تعداد تیس ہے۔

ཀ	ཁ	ག	ང	ཅ	ཆ	ཇ	ཉ
ka	kha	ga	nga	ca	cha	ja	nya
[ka]	[kʰa]	[ga]	[ŋa]	[tɕa]	[tɕʰa]	[dʑa]	[ɲa]
ཏ	ཐ	ད	ན	པ	ཕ	བ	མ
ta	tha	da	na	pa	pha	ba/wa	ma
[ta]	[tʰa]	[da]	[na]	[pa]	[pʰa]	[ba]	[ma]
ཙ	ཚ	ཛ	ཝ	ཞ	ཟ	འ	ཡ
tsa	tsha	dza	wa	zha	za	'a	ya
[tsa]	[tsʰa]	[dza]	[wa]	[ʒa]	[za]	[ɦa]	[ja]
ར	ལ	ཤ	ས	ཧ	ཨ		
ra	la	sha	sa	ha	a		
[ra]	[la]	[ɕa]	[sa]	[ha]	[ʔ]		

حروف علت پانچ ہیں۔

ཨ	ཨི	ཨུ	ཨེ	ཨོ
a	i	u	e	o
[a]	[i]	[u]	[e]	[o]

جو حرکات کا کام کرتے ہیں انہیں کیگو، جسکیو، ڈینگبو اور نارو کہا جاتا ہے۔

ان آوازوں کے علاوہ کچھ حروف کو الٹا کر کے نئی آوازیں بنی ہیں جو چھ ہیں۔ انہیں اگ لوگ کہتے ہیں۔

کھیا، شا، سنا، ڈا، تھا، ٹا۔

ان آوازوں کے باوجود بھی پرگی میں استعمال ہونے والی عربی آوازیں، ث، ح، خ، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، اور ء کے لئے ہمیں پودایگ میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اب اگر ہم نستعلیق پر نظر ڈالیں تو نستعلیق میں تبّتی الاصل آوازوں کے لئے بڑھائی جانے والی علامتوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔آیئے اس پر نظر ڈالیں۔اردو اسکرپٹ کی تعداد ۳۶ مفرد اور ۱۴ مرکب ہیں۔جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

مرکب حروف:

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ

اردو کے اعراب یہ ہیں:

بنیادی حرکات تین ہیں۔ زبر۔۔َ۔۔ زیر ۔ِ۔۔۔،پیش ۔۔۔ُ ۔۔۔۔

ثانوی حرکات:۔ دوزبر ۔ً۔۔۔ دوزیر۔۔۔ٍ۔۔۔ دوپیش۔۔ٌ۔۔

اس کے علاوہ تشدید:۔ تشدید۔ّ۔۔۔ الٹا پیش۔۔۔۔،۔۔۔۔

ان حروف میں مندرجہ ذیل تبّتی الاصل یا مقامی آوازیں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مفرد آوازیں: نا، زا، چا، زا

دومرکب آوازیں: نیا۔رتا۔ردا۔رژا، رزا، زپا، ربا، زچا، زجا، رکا، زگا، لتا، لدا، لژا، لذا۔زنا، زنا۔شکا۔زگا۔سپا، زبا،

اسی طرح سہ حرفی مرکب آوازیں یہ ہیں۔

سکرا، ذگرا، سپیا، زبیا، سنیا، زگیا، زستیا، زدیا، سکوا، زگوا، رکوا۔رگوا، ردوا، سترا، زدرا، سپرا، زبرا، سکیا، زگیا، سپوا، ردوا، رژوا، وغیرہ۔

ان میں سے صرف چار مفرد آوازیں، نا، را، جا اور زا کو ہی نستعلیق میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔جبکہ مرکب آوازوں کو شروع کے حروف کو ساکن کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً۔رنا، جب ہم را اور ن کو حروف تہجی میں شامل کریں تو رْ پر سکون اور ن کو حرکت دے کر رْ نا پڑھ سکتے ہیں۔

اسی طرح سہ حرفی مرکبات اس طرح بنیں گے۔

مثلاً:۔سْکرا۔سْ اور کْ دونوں ساکن ہے۔

اس کے لئے دونوں کی علامت استعمال ہوگی۔جسے صادق علی صادؔق نے اپنے بلتی قاعدے اور محمد علی خان صبا نے اپنی لغت میں تجویز کیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ پرگی کی بڑی بہن بلتی بھی نستعلیق میں ہی لکھی جاتی ہے۔ پرگی بہرحال بلتی سے دور نہیں ہوسکتی کیوں کہ ہمارے تمام ترادبی سرمائے کی جڑیں آخرکار بلتی سے جا کر ملتی ہیں۔

محمد علی شاہ صبا نے اپنی لغت ''بلتی، اردو لغت'' کے اندر اردو سکرپٹ میں مندرجہ ذیل اضافے کئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اضافے اصلاً یوسف حسین آبادی نے کئے ہیں۔

۱۔ چھ۔ (کھرا) جیسے چھق (کھرق) چھو (کھرو) چھک (کھروگ) چھم (کھرم) چھی سلطان چو (کھری سلطان چو

۲۔ چ۔ (کرا)، چسمہ (کرسمہ) چغس (کراغس) جسے پوریگ میں ٹغس کہتے ہیں۔ چلبو (کرلبو

۳۔ ژ۔ ژڑینگ (چنچناہٹ) ژون (جون) سوار ہوجاؤ

۴۔ ش۔ (ہرا) زا) شر (ژر) شرارا (ژرا)

۵۔ گ۔ (گرا) گب (گرب) گنسے (گرقسے) گنمو (گراخمو) گئی (گری)

۶۔ ن۔ نا (نا) نت، نر۔

۷۔ ج۔ (جا) جربا (جربا) جق (جق) جنگ (جنگ) جنگما (جنما)

صابری صاحب نے بلتستان کے معروف ادیب وشاعر اور ایک قدآور شخصیت محمد علی شاہ صبا اور محمد حسین یوسف آبادی کے اضافے پر تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے اپنی بات کو اسی پر ہی ختم کیا ہے۔

ادھر بلتستان میں پوریگ فاؤنڈیشن نامی ایک تنظیم ہے جو پوریگ زبان کے احیائے نو کے لئے کام کر رہی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کے سربراہ رنچن پوریگ نے اپنی کتاب ''پوریگ سکد'' میں پوریگ زبان کے لئے اردو حروف تہجی میں مندرجہ ذیل حروف کا اضافہ کیا ہے۔

ا۔ ''ث'' کے ساتھ ''ھ'' ملا کر وہ ''ژھا'' پڑھتے ہیں۔ ژھا بمعنی نمک۔

جبکہ ''ژ'' کو ''ژ'' پڑھنے کے بجائے فارسی طرز پر ''ژ'' (جا) پڑھتے ہیں۔ مثلاً ژیمبہ بمعنی سلائی کرنا۔

۲۔ ژ کے لئے ر کے آگے ھ لگاتے ہیں۔ جیسے۔ ھرکوقمہ۔ بمعنی گلا۔

۳۔ ن کی آواز کے لئے ن اور گ کو ملا کر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے نگیا مبو۔ بمعنی ساتھ۔

۴۔ پہلا حرف ساکن ہو تو علامت سکون ''ْ'' استعمال کرتے ہیں۔

۵۔ ژ کی آواز کے لئے ایک اور لفظ ژ کا اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے تو ژیب بمعنی یتیم۔ پژے بمعنی چوہا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اعراب کا بھی استعمال کیا ہے۔

کچھ حرف ݲ اور ݧ کے بارے میں۔

پرگ کے معروف بلتی شاعر حاجی صادق علی صادقؔ اپنی کلیات صدائے صادق میں 'ݲ 'یوںٌ لکھتے ہیں 'ج' اور ݧ یوں لکھتے ہیں ن

جنمونگی بگیا دپا بین چی یود — تم ژھون تا نین سینگ ہر ینچہ یود

نایانگلہ غدیا نگے ہلتین چی یود — یا نگ شخی لم پونیگ نورگا لو

اس بند میں صادق صاحب نے ''ی'' دو طریقوں سے لکھا ہے ''ݧ'' اور 'نگا' ݲ اس طرح لکھا ہے ج، اور 'ڑ' کے لئے 'ۂ' اور رکو ملا کر (ہرا) استعمال کیا ہے۔ جبکہ صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ''بلتی سکدی رتخسی شوقبو'' نامی بلتی زبان کا ایک قاعدہ شایع کیا ہے اس میں مندرجہ ذیل حروف کو شامل کیا گیا ہے:

۱۔ݲ ۔ ݲ   ݲ لی۔ بمعنی جھاڑو ۔ݲمہ ۔ بمعنی غیر

۲۔ڑ۔ر   رکوس۔ بمعنی چوری کرنا

۳۔ݧ۔ݧ   ݧِ د۔۔ بمعنی نیند

۴ لہا۔ہل   ہلوق۔ بمعنی چمکنا

پریگ کے دوسرے معروف شاعر آخوند اصغر علی بشارتؔ صاحب اپنی کلیات ''بزم بشارت'' میں یہ حروف اس طرح لکھتے ہیں۔

ݲ ۔ݲ

ݧ ۔ݧ

رجی چوکسومی ݲقلا پیغمبری چھوسی ژھر پو ینگ

مبارک ستونگ مبارک ان دی تاریخ پونا دا نگ چوقلہ۔۱

ان دو مصرعوں میں بشارت صاحب نے ݧ کے لئے ݧ اور نگا دونوں استعمال کیا ہے اور ݲ کے لئے ݲ استعمال کیا ہے۔ اس تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلتستان اور پوریگ دونوں کے ادباء و شعراء بلتی اور پرگی دونوں زبانوں کے لکھنے کے لئے مدت سے نستعلیق کا ہی استعمال کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نستعلیق میں نہ پائے جانے والی آوازوں کے لئے علامات میں ضمنی اختلافات ہیں اور ہر کوئی اپنی پسند کی علامات استعمال کر رہے ہیں تاہم ہم نے پایا کہ اکثر علامات ایک

۱۔ بشارتؔ، آخوند اصغر علی، بزم بشارت، ایف ایس انٹر پرائزر، دریا گنج دہلی، ۲۰۱۱ء ص:۴۶

جیسی ہیں۔

اس لئے میرا نظریہ یہ ہے کہ پرگی کے لئے نستعلیق سے بہتر کوئی دوسری اسکرپٹ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ:

ا۔ پرگی کے لئے نستعلیق کے اردو حروف تہجی میں صرف چار آوازوں حٗ ۔رْ ۔زْ اور نٗ کے لئے علامات مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔جس پر آسانی سے اتفاق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

۲۔ پرگی کے تمام ادبی ورثے کی بنیاد بلتی ، اردو اور فارسی پر ہے۔ تمام علامتیں رمزیات ،کنایات، شعری محاسن اورافسانوی تکنیک وغیرہ یہ سب بلتی، اردواور فارسی کے مرہون منت ہیں۔اور یہ سلسلہ بدیہی طور پر بعد میں بھی قائم رہے گا۔

۳۔اردو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بین الاقوامی حیثیت کی حامل زبان ہے۔جس کے ادب سے پرگی کو فائدہ ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پرگی ادب کی تاریخ میں ہمیں تبّتی رزمیوں، کہانیوں یا منجملہ تبّتی ادب سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے اس زبان کے ادب کو تبّتی زبان کے ادب سے جوڑا جا سکے۔ مثلاً پرگی و بلتی ادب میں بہادروں کے لئے کیسر وغیرہ کا استعمال کرنے کے بجائے رستم کا ذکر کیوں ملتا ہے، یا ایسے ہی دوسرے شعری اوصاف مثلا ردیف، قافیہ، بحر، وزن، علامت، رمز و کنایہ، اصناف شعری اور موجودہ کئی سالوں میں افسانے سب اردو کے نہج پر ہیں جس سے ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ سارے اوصاف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پرگی کے لئے اردو اسکرپٹ سے بہتر کوئی دوسری اسکرپٹ نہیں ہوسکتی۔تاہم اس بات پر جلد از جلد متفقہ رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ [۱]

بلتی زبان اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔اس زبان میں ادب کے حوالے سے اہم نکات کا ذکر دیگر ابواب میں کیا جائے گا۔بلتی ادب کے بارے میں ذکر کرنے سے پہلے ہم خطہ لداخ و بلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات، کا جائزہ لیں گئے۔

ا۔محمد عیسی صابری نے ان تجاویز کو آل انڈیا ریڈیو کرگل کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

باب سوم

خطہ لداخ وبلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات

خطہ لداخ وبلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات

اردو زبان لداخ و بلتستان میں مغلوں کی حکومت کے دوران رابطے کی زبان کے طور پر پروان چڑھی۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب سے اردو زبان وجود میں آئی لداخ و بلتستان میں آنے والے پنجابی اور کشمیری اردو داں تاجروں کی وساطت سے لداخی اور بلتی اردو سے آشنا ہوئے۔ بعد میں ڈوگرہ حکومت نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا۔اس لئے اردو زبان کا اثر مقامی زبان پر ہونا ناگزیر تھا۔اردو نے آگے چل کر بلتی کو اپنا رسم الخط دیا۔آج بلتی میں اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی سینکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔

اردو لداخ اور بلتستان کی مقامی زبان کے بعد مقبول عام زبان ہے۔دونوں خطوں میں اردو اور بلتی زبان میں اخبارات چھپتے ہیں۔جن کے ہزاروں قارئین ہیں۔مذہبی،سماجی،سیاسی اور ثقافتی تقریبات میں بلتی اور اردو دونوں زبانوں کا استعمال ہوتا ہے۔اس لئے بلتی زبان وادب پر اردو کا دوررس اثر پڑا ہے۔

''تاریخی حقائق وشواہد کے مطابق ۱۸۴۰ء میں بلتستان پر ڈوگرہ راج قائم ہوا۔سلطنت ڈوگرہ میں بلتستان کے لوگوں کا کشمیر اور کشمیر کے راستے ہندوستان میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بلتستان کے لوگ روزگار اور دیگر ضروریات کی تلاش میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرنے لگے۔یوسف حسین آبادی کے خیال میں یہی مزدور طبقے'' وہ اولین بلتی افراد ہیں جو عوامی سطح پر بلتستان میں پہلی بار اردو زبان درآمد کرنے کا سبب بنے۔''

(یوسف حسین آبادی، بلتستان میں اردو تصانیف اور تالیف، مشمولہ: پاکستان میں اردو، تیسری جلد، مرتبین: پروفیسر فتح محمد ملک، سید احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول پیرزادہ، تجمل شاہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۶ء، ص، ۲۲۵)

اس ضمن میں کاچو اسفندیار خان کا خیال ہے:

''یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ لداخ کا محل وقوع ایک ایسی جگہ پر ہے۔جس کے مشرق میں چین ،شمال میں ترکستان اور جنوب مغرب میں کشمیر اور ہندوستان واقع ہے۔یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ چین اور ترکستان کی زبانیں ہندوستانی اور اردو سے مختلف ہیں،جن میں اردو یا ہندی کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ترکستان کی زبان میں کچھ فارسی کے الفاظ ہوں تو ہوں لیکن ہندوستانی کے ساتھ اس کا کوئی لسانی رشتہ نہیں ہے۔اس لیے یہ بات باوثق سے کہی جا سکتی ہے کہ لداخ میں اردو کی ابتدا چین اور ترکستان کے ملکوں سے رابطے کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ لداخ میں اردو کا آغاز اور اس کے فروغ کے بارے میں جاننا چاہیں تو ہمیں کشمیر اور ہندوستان کی طرف رخ کرنا پڑے گا۔کیونکہ زمانہ قدیم میں جب بھی اور جس قدر بھی اردو یا ہندوستانی لداخ

میں بولی یا سمجھی جاتی تھی، یہ ان لوگوں کی مرہون منت تھی جو ہندوستان اور کشمیر سے تجارت کی غرض سے یا مہم جوئی کے سلسلے میں یہاں آتے تھے۔

(اردو صحافت کے دوسو سال، لداخ میں اردو صحافت، جلد اول، مرتب، ارتضی کریم؛ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۷، ص ۳۱۱۔)

اردو کو ۱۸۸۹ء میں سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو رابطے کی زبان کے طور پر اپنی ریاست میں نافذ کیا اور اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا گیا۔ پھر اس زبان کی ترویج واشاعت اور فروغ کے لیے اسکولوں میں اسے ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا گیا۔ جب لیہہ اور کرگل میں سرکاری اسکول کھولے گئے تو ان میں اردو اور انگریزی زبان تعلیم کا میڈیم قرار پائی۔ رفتہ رفتہ ان اسکولوں سے پڑھے لکھے لوگ نکلنے لگے تو یہ زبان بھی ایک متبادل زبان کے طور استعمال ہونے لگی اور اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

لداخ میں جب اردو پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی تو اردو اخبارات کے ذریعہ بیرونی دنیا کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جیسا کہ انگریزوں کی وجہ سے ملک میں ڈاک کا نظام کافی حد تک منظّم اور قابل اعتبار تھا۔ اس لیے کشمیر اور لاہور وغیرہ سے اردو اخبارات پہونچنے لگے اور چند پڑھے لکھے افراد ان اخباروں کے تراشے لوگوں کو سناتے تھے۔ اس طرح لوگوں میں خبر سننے کی عادت شروع ہوئی۔ لداخی عوام بیرونی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے لگی۔ آزادی سے قبل کشمیر اور لاہور سے ڈاک کے ذریعہ کئی اخبارات اور رسائل موصول ہوتے تھے۔ ان میں مخزن، صداقت، خلافت، زمیندار، انقلاب، ملاپ جیسے رسائل اور اخبارات قابل ذکر ہیں۔

اردو اخبارات لداخ اور بلتستان کی علاقائی زبان پر اثر انداز ہوئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کے بہت سے الفاظ وہاں زبان زد ہوگئے اور رفتہ رفتہ یہ بلتی زبان میں شامل ہوگئے۔ خطۂ لداخ میں اردو زبان کی روایت مغلوں کے دور حکومت سے ملتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی آمد کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی رہی۔ تقریباً ۱۸۳۵ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ مغلوں نے پورے کشمیر تک قبضہ کر رکھا تھا اور اس دوران جموں وکشمیر پر ڈوگرہ راجاؤں نے قبضہ کرلیا۔ عام فہم زبان ہونے کی وجہ سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ لداخ میں اردو زبان سرکاری زبان بننے سے قبل ایک عام زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ مورخین بتاتے ہیں کہ سلک روٹ کے ہونے کی وجہ سے لوگ یہاں تجارت کرنے آتے تھے اور ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے اردو کا استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان کے الفاظ اور محاوروں کے اثرات مقامی زبان پر پڑنے لگے۔ مثلاً ایک محاورہ جو

مقامی زبان اوراردو کے میل جول سے بنا ہے ''کھے کھارہ نسینی آرہ'' یعنی زبان کا میٹھا لیکن دل کا برا۔اس محاورہ میں اردو لفظ ''آرہ'' استعمال ہوا ہے۔ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو مقامی زبان میں اسی طرح گھل مل گئے ہیں۔

عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

''تاہم حالات وکوائف بتاتے ہیں کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے سے بہت پہلے لداخ میں اردو باہمی لین دین اور آپسی تبادلۂ خیال کے لئے رابطے کی زبان کی حیثیت سے مقبول تھی۔تب لداخ ایک خودمختار خطہ تھا۔لیہہ وسط ایشیاء کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔بہت سارے پنجابی کے ساتھ لداخی ترکی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔پنجابیوں اور کشمیریوں کے ساتھ لوگ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات چیت کرتے تھے۔۱۸۲۰اور۱۸۲۱ء کے دوران ایک انگریز مورکرافٹ لداخ میں تھا۔وہ رقم طراز ہے:''کرگل میں ہر گاؤں میں ایک یا دو فارسی اور ہندوستانی جاننے والے تھے۔''۱

جب ہندوستان کی مرکزی زبان فارسی بنی تو اس کا اثر گرد ونواح کی زبانوں پر بھی ہوا۔لداخی راجے کشمیری حکمرانوں کے ساتھ فارسی میں تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ماہرین کے مطابق اردو رائج ہونے سے دوسو سال پہلے فارسی لداخ کے راج دربار کی زبان تھی۔اس سلسلے میں عبدالغنی شیخ رقم طراز ہیں:

''مسلمانوں نے ریاست میں اردو کو سرکاری زبان بنانے سے دوسو سال پہلے لداخ کو فارسی سے روشناس کیا۔لداخ مغلیہ حکومت کا باج گزار تھا اور لداخ کے راجے کشمیر کے مغل گورنر سے فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے۔اس ضمن میں لداخی راجہ نے کشمیر سے ایک فارسی داں مسلمان کو مدعو کیا اور لیہہ میں آباد کیا''۔۲

شاہی حکومت تہذیب وثقافت اور زبان وادب کو متاثر کرتی ہے۔اس کا اندازہ ہم قدیم تاریخ لداخ و بلتستان سے لگا سکتے ہیں۔جب پورے لداخ عظمیٰ میں بون مذہب کی حکومت تھی تب یہاں کی تہذیب وثقافت کا رنگ ڈھنگ جدا تھا۔بدھ مت کے آنے کے بعد لوگوں کے طرز زندگی مین بدلاؤ آیا۔مغل اور ڈوگرہ راج آنے کے بعد لداخ اور بلتستان کی تہذیب اور ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

لداخ اور بلتستان میں پہلے پہل لوگ ایگے رسم الخط کا استعمال کرتے تھے۔فارسی سے مانوس ہونے کے بعد فارسی میں خط وکتابت شرع ہوئی۔اس کے بعد اردو سے متعارف ہونے کے بعد لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول

۱۔(لداخ:تہذیب وثقافت،ص:۳۲۸)

۲۔(ایضاً)

ہوئی۔عبدالغنی شیخ صاحب لکھتے ہیں:

''وسط ایشیا سے تجارتی امور کی نگرانی کے لئے لیہہ میں متعینہ انگریز جوائنٹ کمشنر نے اکتوبر ۱۸۸۲ء میں اپنی ڈائیری میں لکھا ہے۔:''لداخی فارسی رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔یہ کشمیر کی سرکاری زبان ہے کیوں کہ یہ ہندوستانیوں اور ترکی تاجروں میں آپسی میل جول کے دوران عملی طور زیادہ مفید ہوسکتی ہے۔(اشارہ اردو کی طرف ہے۔ترکی تاجر بھی اردو رسم الخط میں لکھتے تھے'')۱

اردو کی مقبولیت یا اس سے لگاؤ کا اندازہ ہم اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۸۵ میں موروین مشنری نے لداخ میں اسکول کھولنا چاہا تو اس میں ایک مضمون اردو کا بھی رکھا۔جب کہ اس وقت یہ زبان سرکاری زبان نہیں بنی ہوئی تھی۔

اردو کو سرکاری زبان بنانے کے بعد ۱۹۴۰ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں خواجہ غلام سیدین کی سفارش پر یہ ذریعہ تعلیم بنی۔زمانے کی حالات اور کوائف کو جاننے کے لئے اخبارات کا اہم رول ہوتا ہے برٹش انڈیا میں کئی اخبارات پر پابندیاں عائد تھیں۔ یہ پابندیاں اور بندشیں لداخ میں بھی تھیں۔پھر بھی اس وقت کے اردو اخبارات جیسے انقلاب،زمیندار اور ہمدرد وغیرہ وہاں پہنچتے تھے۔اس دور میں زبان کے مسئلہ میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔

اردو کو سرکاری زبان بنانا اور اسے ذریعہ تعلیم بنانا یہ اس لئے ممکن ہو کہ اس خطہ کے لوگ اس زبان کو جانتے تھے اور اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔یہ زبان خطہ سے باہر کشمیر اور جموں کے علاوہ پورے ہندو پاک، بلکہ پورے برصغیر میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔یہ حقیقت ہے کہ ایک زبان جو دفتری زبان کی حیثیت رکھتی ہے لوگوں کو اسے چاہے نہ چاہے سیکھنا ہی پڑتا ہے۔جس طرح موجودہ دور میں انگریزی کے کچھ الفاظ ہر کس و ناکس کے تکیہ کلام بنے ہیں۔مثلاً

''لداخی زبان کی ترکیب،ساخت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس میں اردو، ہندی یا فارسی کے الفاظ نہیں پھپتے۔اس لئے لداخی ادیب اور مترجم متبادل اور نئے الفاظ کے لئے تبتّی ماخذ سے الفاظ ڈھونڈتے ہیں یا لداخی لفظ یا مرکبات سے تلمیحات اور اصطلاحات وضع کرتے ہیں۔تاہم متعدد اردو الفاظ لداخی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ ان کے بغیر لداخی نامکمل ہوگی۔۲

۱۔(لداخ تہذیب وثقافت،ص:۳۲۸) (۲)(ایضاً،ص:۳۳۵)

چند اردو الفاظ جو لداخ وبلتستان میں استعمال ہوتے ہیں۔جیسے۔کمرہ۔کمبل، چلم، کشتی، بنیان، کلچہ، بستہ، میز، پیوند، دیدی، خواجہ، برقع، گلاب، قالین، شال، دری، مخمل، رنگ، دیگ، آرہ، کباب، گوشتابہ، یخنی وغیرہ۔

سبزی جات جیسے:۔آلو، بند گوبھی، پھول گوبھی،

بہت سارے الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں بلتی/لداخی زبان کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ جیسے

اردو	بلتی/لداخی	اردو	بلتی/لداخی
جنازہ	جناز	بالٹی	بالٹین
چادر	ژادر	مردار	مل دار
موتی	موتیک	موم بتی	موم بتی/بتی
قمیض	کمیز	تمباکو	تمباکو/تمق
نیند	نیت	قفل	کولیک
توا	تو/تاؤ	مسجد	مجید
فلیتہ	فتیلہ	دارچینی	دالچین۔

اس طرح سے اردو کے سینکڑوں الفاظ اصل صورت میں یا تھوڑا ترمیم کے ساتھ بلتی / پرگی/لداخی زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ مزید الفاظ اگلے صفحات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اثر۔نتیجہ،فائدہ

اجر۔معاوضہ،انعام

اجارہ۔کرایہ،ٹھیکہ

اجرت۔مزدوری

اجل۔موت

اخبار۔اخبار

آخر۔پچھلا،انجام

ادب۔سلیقہ،تہذیب

آرام۔سکون،قرار

اصل۔صحیح

اضافہ۔بیشی۔ترقی

افسوس۔حسرت

افواہ۔اڑتی خبر۔

افطار۔روزہ کھولنا

آل۔خاندان

امام۔پیشوا

انعام۔صلہ

آئینہ۔شیشہ

بجلی۔بجلی

بخار۔حرارت،تپ

بخاری۔چمنی،انگیٹھی

بلبل۔ایک پرندہ

بھنڈی۔ایک سبزی کا نام

پسند۔حسب خواہش

تابعدار۔مطیع وفرمانبردار

تاج۔شاہی ٹوپی

تباہ۔ویران،برباد

تبرا۔نفرت،بیزاری

تبرک۔تحفہ۔

تپ۔بخار

تخت۔مسند

تختہ۔تختہ

ترازو۔ترازو

ترجمہ۔ترجمہ

تردد۔تذبذب

تسنیم۔بہشت کی ایک نہر

تشہد۔کلمہ شہادت پڑھنا

تصدیق۔صداقت،سچائی

تصویر۔نقشہ

تعداد۔گنتی

تعریف۔مدح

تعطیل۔چھٹی

جلاب۔مسہل

جلیبی۔ایک قسم کی میٹھائی

جن۔بھوت،دیو

جناب۔حضرت،حضور

جنازہ۔لاش

جنت۔بہشت

جنتری۔تقویم

جنگ۔معرکہ،لڑائی

جنگل۔درختوں کی کثرت کا مقام

جنوب۔شمال کے مقابل سمت

جواب۔سوال کا متضاد،مقابل

جوان۔بوڑھے کا متضاد۔تازہ

جہاز۔جہاز

جھولی۔تھیلا

جہنم۔جہنم،آخرت میں برے اور گنہگار لوگوں کا ٹھکانا

چالاک۔چست،مکاری

چاندی۔نقرہ

چائے۔چائے

چپ۔خاموش

چرس۔ایک قسم کی نشے والی چیز

چمن۔چھوٹا سا باغیچہ

چنبیلی۔ایک مشہور خوشبودار پھول

چوکی۔پولیس کا چھوٹا سٹیشن

حاتم۔بلند حوصلہ شخص،کریم

حاجت۔آرزو،خواہش

حاشیہ۔کنارا

حاضر۔موجود،

حافظ۔حافظ

حاکم۔حاکم،حکم کرنے والا

حال۔کیفیت،موجودہ زمانہ

حالت۔درجہ

حتی۔اس قدر،یہاں تک

حج۔حج

حجت۔برہان،دلیل

حجرالاسود۔کالا پتھر

حد۔انتہا،کنارا

حدیث۔بات،خبر

حرام۔خلاف،ناجائز

حرام خور۔حرام خور

حرام زادہ۔ولدالزنا

حرکت۔دھڑکن۔جنبیش

حساب۔گنتی،شمار

حساب کتاب۔لین دین

حسب نسب۔ماں باپ کا خاندانی سلسلہ

حشر۔قیامت

حصہ۔تقسیم،ٹکڑا

حضرت۔جناب،قبلہ

حضور۔جناب،سامنے،روبرو

حفاظت۔نگرانی،پاسبانی

حق۔سچ،درست،بجا

حقیر۔ذلیل،ادنی

حقیقت۔اصل،صداقت

حکم۔فرمان،ارشاد

حکمت۔ترکیب،غرض،تدبیر

حکومت۔راج،اختیار،

حکیم۔طبیب،عقلمند،دانا

حلال۔جائز،ذبح کیا ہوا

حلوا۔میٹھا،نرم شرینی

حمام۔نہانے کی جگہ

حمائل۔گلے میں ڈالنے کی چیز

حمد۔خدا کی تعریف

حملہ۔یورش

حوا۔آدمؑ کی بیوی

حوالات۔تحویل،حراست

حور۔خوب صورت عورتیں جو بہشت میں

نیک ادمیوں کی خدمتگار ہوں

حیا۔شرم،حجاب

حیثیت۔ساکھ،اعتبار

حیدر۔شیر،پھاڑنے والا

حیران۔متعجب،پریشان

حیلہ۔فریب،دھوکہ

حیوان۔ذی روح،زندگانی،نادان

حیوانیت۔بے حیائی،نادانی

خاص۔ذاتی،مخصوص

خال۔تل،کم

خان۔رئیس،سردار

خاندان۔قبیلہ،نسل،گھرانہ

خانقاہ۔مشائخ رہنے کی جگہ

خبر۔اطلاع،آگاہی

ختنہ۔ختنہ

خدا۔مالک،خالق کائنات

خرما۔کھجور

خزانچی۔خزانہ رکھنے والا

خزانہ۔خزانہ

خصلت۔عادت

خضاب۔مہندی

خط۔چھٹی،لکیر

خم۔گہرائی

خمیرہ۔کھانڈ میں پکائی ہوئی دوا

خنجر۔کٹار،ایک قسم کا چھرا

خندق۔خندق

دارچینی۔ایک درخت اوراس کے چھال

داغ۔عیب،نشان

دال۔دال،مونگ

دالان۔دالان

دائمی۔عمر بھر کے لیے۔ہمیشہ کے لیے

دجال۔دجال

دربار۔شاہی عدالت

دربدر۔آوارہ،لفنگا

درجہ۔عہدہ،رتبہ

درخواست۔عرضی،التماس،آرزو

درزی۔کپڑا سینے والا

درنجف۔درنجف

دریتیم۔قیمتی موتی

دست۔پتلا پاخانہ

دست بردار۔چھوڑ دینا،باز آنا

دست خط۔اپنے ہاتھ کی علامت یا نشانی

دسترخوان۔دسترخوان

دستور۔رسم ورواج

دشمن۔بدخواہ،مخالف

دعا۔درخواست کرنا،مناجات پڑھنا۔

دعائے خیر۔نیک دعا

دعویٰ۔مطالبہ،استحقاق

دعوت۔ضیافت

دعوت ولیمہ۔شادی کی دعوت

دغا۔فریب،دھوکہ

دغاباز۔مکار،جعلساز

دف۔ایک آلہ موسیقی

دفتر۔محکمہ

دفن۔دفن

دکان۔دکان

دیگ۔کھانا پکانے کا بڑا برتن

دین۔عقیدہ،مذہب

ڈاق۔ڈاک

دوپوش۔گرز،ایک ہتھیار

دور۔چکر،گردش

دوربین۔دوراندیش،دور کی چیز دیکھنے کا آلہ

دوغلی۔دوطرفہ

ڈب۔قبضہ کرنا یا قابو کرنا

ڈھولکی۔ڈھولک

ڈھول۔ڈھول

ذات۔نسل،ہستی،قوم

ذاکر۔قصہ سنانے والا

ذخیرہ۔گودام،خزانہ

ذرہ۔ذرہ

ذریعہ۔باعث،وجہ،وسیلہ

ذمہ۔امانت،کفالت

ذہن۔فراست،دانائی

زبانی۔سنی سنائی،ظاہری

زبور۔وہ آسمانی کتاب جو حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی۔

زمانہ۔عرصہ،وقت،عہد

زمزم۔آب زمزم

زنا۔بدکاری

زیادہ۔افزوں،فالتو

زیارت۔کسی کچ دیکھنے جانا یا مقدس مقام کا دیکھنا۔

سبب۔دلیل،موجب

سبق۔تعلیم،درس

سبیل۔سبیل

سپاہی۔ملازم،فوجی

سر۔بھید،راز

سزا۔تعزیز

سستا۔کم قیمت

سلام۔آداب،دعا

سلائی۔آگ جلانی کی تیلی،ماچس

سلسبیل۔خوشگوار چیز۔بہشت کی ایک نہر

سمت۔طرف

سمن۔عدالتی بلاوا

سمندر۔ساگر

سوال۔دریافت،مسئلہ

سیٹھ۔دولتمند

سید۔پیشوا،سردار،امام

سیر۔ہواخوری،چہل قدمی،تفریح

شاعر۔شاعر

شافع۔شفاعت کرنے والا

شاگرد۔استاد سے کچھ سیکھنے والا

شال۔پشمینہ،اون یا پشم کی چادر

شام۔وقت مغرب

شام غریبان۔مصیبت کی شام

شب برات۔شعبان کی چودھویں یا پندرھویں تاریخ کی درمیانی رات

شب قدر۔عظمت والی رات

شبر۔سبط اکبر

شبیر۔نیک،خوبصورت

شجاعت۔دلیری،مردانگی

شجرہ۔سلسلہ،نسب نامہ

شربت۔پینے کی میٹھی چیز

شرک۔بت پرستی،کفر

شریعت۔طریقہ،دینی قانون

شعر۔موزون کلام

شغل۔کام کاج

شفا۔تندرستی،صحت

شفق۔خارجی،بیرونی

شفیع محشر۔حشر میں شفاعت کرنے والا

شک۔شبہ،گمان،احتمال

شکایت۔شکوہ،گلہ

شکر۔احسان

شکل۔چہرہ،صورت

شمال۔ڈوبتے سورج کی دائیں سمت

شہادت۔صحیح خبر، گواہی

شہد۔شہد

شہدا۔شہید کی جمع

شہر بانو۔شہر کی امیر زادی

شیخ۔عرب کا سردار، عالم وفاضل

شیریں۔رس دار، میٹھا

شیطان۔نافرمان

شیطنیت۔شرارت

شینا۔وہ زبان جوشین قوم بولتی ہے

صابر۔صبر کرنے والا

صابن۔صابون

صاحب۔یار، دوست، حاکم

صاحب حیثیت۔دولتمند۔امیر

صاف۔بے داغ

صبا۔مشرقی ہوا۔

صبر۔برداشت،تحمل

صحابہ۔صاحب کی جمع، دوست، یار

صحائف۔رسالے

صحبت۔ہم نشینی، دوستی، آشنائی

صحت۔تندرستی

صحن۔دالان،آنگن

صحیح۔ٹھیک، بجا

صد۔سو

صدارت۔میر محفل کی حیثیت، سربراہ سلطنت کا عہدہ

صدر۔کسی ادارے کا یا مملکت کا با اختیار سربراہ

صدقہ۔خیرات

صراط۔راہ راست، راستہ

صراط مستقیم۔سیدھا راستہ

صغرا۔سب سے چھوٹی چیز

صفا۔پاک، پاکیزہ

صفر۔قمری مہینوں کا دوسرا مہینہ

صل۔درود بھیجنا

صلح۔اپس کی صفائی، دوستی

صلوات۔صلوۃ کی جمع

صندوق۔صندوق

صنوبر۔ایک درخت کا نام

صوبہ۔صوبہ

صور۔بگل

صورت۔حالت، چہرہ،طریق

صوفی۔پارسا،اہل تصوف

صوم وصلوۃ۔روزہ ونماز

صیاد۔شکاری

صیام۔روزے

صیقل۔صفائی، چمک مک، جلا

صیہونیت۔یہودیت

ضامن۔ذمہ دار

ضبط۔نگرانی میں رکھنا، قید

ضد۔مخالف، انانیت، عداوت

ضرور۔لازم، بجا

ضریح۔مزار، مقبرہ

ضلع۔ضلع، لکیر، خط

ضمانت۔کفالت، ذمہ داری

ضیافت۔دعوت، مہمانی

طاعت۔بندگی، فرمانبرداری

طاعون۔پیلک، ایک بیماری کا نام

طاقت۔زور، بساط، قوت

طالب علم۔علم حاصل کرنے والا

طب۔ڈاکٹری کا علم

طبق۔بڑی رکابی، حصہ، خطہ

طبیب۔حکیم، معالج

طبیعت۔خیال، مزاج، خلقت

طرفدار۔مددگار

طریقہ۔ترکیب، قاعدہ

طلاق۔عورت کا قید نکاح سے آزاد ہونا

طلسم۔جادو

طواف۔کسی بزرگ یا مقدس مقام کے گرد پھرنا

طوبیٰ۔فردوس برین کا ایک نہایت خوشبودار درخت

طور۔ایک مقدس پہاڑ کا نام

طوس۔خراسان کا ایک متبرک شہر

طوطا۔توتا،

طوفان۔طغیانی یا ہوا کی شدت، تباہ کن سیلاب

طومار۔لمبی دستاویز، خواتین کے ٹوپی پر سنجانے کے زیورات

طٰہٰ۔قرآن کریم کی ایک سورت

طہارت۔پاکی، صفائی

طیار۔اڑنے والا

طیارہ۔اڑنے والی چیز، ہوائی جہاز

ظالم۔سفاک، ظلم کرنے والا

ظاہر۔واضح، آشکار

ظلم۔زیادتی، بے رحمی

عابد۔پرہیزگار، عبادت گزار

عاجز۔ناتوان، مجبور، مایوس

عادت۔خصلت، طور طریقہ

عادل۔انصاف کرنے والا

عارضی۔اتفاقیہ

عاشق۔فریفتہ، عارف، چاہنے والا۔

عاشور۔محرم کے دسویں تاریخ

عاصی۔نافرمان، گنہگار

عافیت۔سلامتی

عاق۔ماں باپ کا نافرماں

عاقبت۔انجام،نتیجہ،آخرکار

عاقل۔ہوشیار،دانا

عالم۔جاننے والا

عالَم۔جہاں،دنیا

عام۔سب لوگ،مشہور،رسمی

عبا۔جبہ

عبادت۔اطاعت،بندگی

عبارت۔مراد،بیان،تحریر

عجائب۔عجیب کی جمع

عجب۔نادر،انوکھا

عجم۔ملک ایران وتوران

عجمی۔عجم کا رہنے ولا،گونگا اور وحشی،عربی زبان نہ سمجھنے والا

عجیب۔حیرت انگیز

عدالت۔برابری

عداوت۔مخالفت،دشمنی

عدت۔تعداد،شمار

عدل۔انصاف،برابری

عذاب۔اذیت

عذر۔حیلہ

عراق۔ملک کا نام

عرب۔اہل عرب

عربی۔عرب سے منسوب زبان

عرس۔عرس

عرش۔اسماں

عرش معلیٰ۔عرش اعظم

عرض۔التماس۔اظہار

عرضی۔تحریری درخواست

عرفات۔مکہ سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک مقدس میدان

عرفی۔مشہورم،رسمی

عرق۔رس،کشید کے ذریعے نکالا ہوا پانی۔

عزت۔عزت،عظمت،بزرگی

عزرائیل۔جان نکالنے والا فرشتہ

عزیز۔دل پسند،قریبی رشتہ دار،پیارا

عسل۔شہد

عشا۔رات کی نماز

عشق۔بے حد پیار محبت جو جنوں کی حد تک ہو۔

عضا۔لاٹھی

عصمت۔پارسائی

عصیان۔خطا،گناہ

عضو۔جز

عطر۔مہک،خلاصہ،لب لباب

عطیہ۔انعام،بخشش

عفت۔پرہیزگاری

عفو۔بخشش

عقاب۔بلند پرواز شکاری پرندہ

عقبیٰ۔دوسری دنیا۔عاقبت

عقد۔بندھن،نکاح

عقل۔شعور،تمیز

عقل کل۔عقل کامل

عقیدت۔ایمان،بھروسا،مذہب کے اصولوں پر یقین

عقیقہ۔مونڈن

علاج۔معالجہ،دوا،تدبیر

علاقہ۔احاطہ،رابطہ،تعلق

علالت۔دکھ،بیماری

علام العیوب۔غیب کاعلم جاننے ولا

علامت۔پتہ،نشانی،آثار

علامہ۔نہایت عالم وفاضل

علانیہ۔کھلم کھلا،بسرعام

علم۔نشان،جھنڈا

علم دار۔جھنڈااٹھانے والا

عِلم۔واقفیت،اگاہی،ہنر

علم لدنی۔وہ علم جوکسی کو خدائے علیم وخبیر کی طرف سے محض اس کے فیض سے بغیرازمحنت واستاد حاصل ہو۔

علما۔عالم کی جمع

علی۔اونچا،بلند

علیہ الرحمہ۔اس پرخدا کی رحمت ہو

علیہم السلام۔ان سب پرخدا کا درود اورسلام ہو

علیین۔بہشت کا نام

عمداً۔جان بوجھ کر

عمر۔عہد،زمانہ،سن وسال

عمران۔حضرت موسی کے والد کا نام

عمرہ۔حاجیوں کا ایک خاص عبادت

عنایت۔توجہ،مہربانی،لطف

عنبر۔ایک قسم کی خوشبودار چیز

عندلیب۔بلبل،ہزارداستان

عنقا۔نایاب شئے،سیمرغ

عنکبوت۔مکڑی

عوام۔رعایا،عام لوگ

عود۔ایک قسم کی سیاہ لکڑی جوآگ میں جل کر نہایت عمدہ خوشبو دیتی ہے۔

عوض۔معاوضہ،بدلہ

عہد۔قول وقرار،وقت،زمانہ

عہد حکومت،ایام حکومت

عہد نامہ۔تحریرقول وقرار،معاہدہ

عہدہ۔منصب،رتبہ

عہدہ دار۔صاحب منصب،ذی رتبہ

عیاری۔دھوکابازی،چالاکی

عیاشی۔اوباشی،تن آسانی

عیال۔گھر والے،فرزند

عیب۔برائی

فخر۔ناز

فدا۔قربان

فرات۔ایک دریا کا نام جو عراق میں ہے

فردوس۔جنت

فردوسیؔ۔حکیم،ابوالقاسم منصور طوسی کا تخلص

فرزند۔فرزند،اولاد

فرسخ۔تین میل کی مسافت،کوس

فرش۔بستر،بچھونا

فرشتہ۔ملک،فرشتہ

فرصت۔خلوت کا وقت،چھٹکارا

فرض۔لازمی امر

فرق۔تفاوت،اختلاف

فرقہ۔فریق،گروہ،جماعت

فرنگ۔براعظم یورپ

فرنگی۔یورپی

فرنی۔ایک قسم کی کھیر

فریاد۔آہ ونالہ،شوروغل

فریب۔دھوکہ۔مکر،چالاکی

فریضہ۔فریضہ

فریقین،دونوں فریق

فساد۔ہنگامہ،شرارت

فسادی۔جھگڑالو،شریر

فصاحت۔خوش بیانی

فصل۔اناج،پیداوار

فضول۔زائد،بے کار

فضیلت۔بڑائی

فطرت۔قدرت،پیدائش،اصل

فطرہ۔عیدرمضان کا صدقہ

فقط۔محض،صرف

فقہ۔علم دین،احکام شریعت کی واقفیت

فقیر۔محتاج،تارک الدنیا،

فکر۔غور،تدبیر

فکرمند۔غمگین

فلاطون۔ایک یونانی حکیم

فلاں۔کوئی شخص

فنا۔ناپید،نیستی

فوارہ۔فوارہ

فوج۔لشکر

فوجداری۔وہ محکمہ عدالت جس میں جھگڑے،
قتل وغیرہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ ہو

فوراً۔بلاتوقف،جلدی سے

فولاد۔جوہردارلوہا

فی امان ال••۔خدا کی پناہ میں

فی زمانہ۔آج کل،اس دور میں

فیصلہ۔تصفیہ

قاب۔بڑی رکابی،تھال

قاب وقوسین۔دوکماں کا فاصلہ،نہایت قرب

قابل۔لائق،مناسب،عقلمند

قابو۔رسائی،قدرت،طاقت

قابیل۔حضرت آدم کا بیٹا

قاتل۔جلاد،قتل کرنے والا

قارون۔حضرت موسیٰؑ کا چچازاد بھائی

قاری۔وہ شخص جوعلم قرات سے واقف ہو

قاصد۔نامہ بر،ارادہ کرنے والا

قاضی۔جج،مسلمانوں کا منصف جوشریعت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے

قاضی الحاجات۔حاجت روا کرنے والا

قاعدہ۔ضابطہ،طریقہ،قانون

قافلہ۔مسافروں،تاجروں کا گروہ

قالب۔ہیئت،سانچہ

قالی۔قالین

قانون۔آئین،دستور

قانون گو۔ضابطہ مال جاننے والا

قائد۔راستہ بتانے والا،لیڈر

قائم۔مضبوط،پائدار

قائم مقام۔نائب،دوسرے کی جگہ کھڑا ہونے والا

قبا۔ایک قسم کا لباس

قباحت۔مشکل،مصیبت،نقص

قبائل۔اقوام،خاندان

قبر۔مدفن

قبض۔دخل،پاخانہ نہ آنا

قبرستان۔وہ جگہ جہاں مردوں کو دفنایا جاتا ہے

قبضہ۔قابو،تصرف

قبلہ۔کعبہ شریف،جناب،حضور

قبول۔ماننا،منظور

قبلہ گاہ۔بجائے قبلہ،والد بزرگوار

قبہ۔برج،گنبد

قتل۔ہلاکت،خون

قتل گاہ۔قتل کرنے کی جگہ

قحط۔خشک سالی

قدر۔عزت،بڑائی،مقدار

قدرت۔طاقت،حوصلہ،اختیار

قدرتی۔فطری،اصلی،حقیقی

قدردان۔صاحب نظر،قدرشناس

قدرے۔ذراسا،کچھ

قدسی۔متبرک

قدم۔پیر،پاؤں

قدیم۔پرانا،آبائی

قرات۔حرفوں کا صحیح مخرج ادا کرنا

قرار۔قول وقرار،آرام وسکون

قرآن۔قرآن،وہ کلام جوحضرت محمدؐ پر نازل ہوا

قرب۔نزدیکی،رشتہ

قربان۔نثار،فدا

قسائی۔گوشت فروش

قسط۔جزو،حصہ

قسم۔سوگند

قسم۔نوع،ڈھنگ

قسمت۔احاط،حصہ،مقسوم،تقسیم کیا ہوا

قصاص۔بدلہ،جان کے بدلے جان

قصد۔اقدام،ارادہ،نیت

قصر۔محل،حویلی،اختصار

قصور۔غلطی،بھول

قصہ۔داستان،واقعہ،قضیہ

قصہ خوان۔ذاکر،داستان گو

قصیدہ۔وہ نظم جو کسی کی مدح کے ارادے سے کہی جائے۔

قضا۔موت،اجل،وہ عبادت جو مقررہ وقت کے بعد ادا کی جائے

قضیہ۔مقدمہ،جھگڑا،فساد

قط۔کاٹنا

قطار۔لمبی صف،سلسلہ

قطرہ۔بوند،نہایت کم

قطمیر۔اصحاب کہف کا کتا

قلت۔دشواری،مشکل،کمی

قلعہ۔وہ سنگین اور محفوظ عمارت جس میں بادشاہ،حاکم یا فوج رہے۔

قلم۔لکھنے کا آلہ،کاٹی ہوئی ہری شاخ یا ٹہنی

قمیص۔کرتہ،پیراہن

قنات۔کپڑے کی بنی ہوئی وہ دیوار جو شامیانہ یا صحن کے چاروں طرف لگاتے ہیں

قناعت۔اکتفا

قنوت۔قنوت

قوال۔صوفیانہ کلام گا کر سنانے والے

قوالی۔قوالی،وہ گانا بجانا جو اکثر صوفیانہ کلام اور حمد و نعت اور حقانی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے

قوت۔توانائی،سہارا،طاقت

قوس۔کمان،آسمان کا نواں برج

قوس قزح۔دھنک

قوم۔آدمیوں کا گروہ،ذات،نسل

قہار۔غالب آنے والا،جبر و قہر کرنے والا

قہر۔زبردستی،زیادتی،تندی

قہر الٰہی۔خدا کا غضب

قہوہ۔کافی

قے۔الٹی،متلی

قیام۔کھڑا ہونا

قیامت۔وہ دن جب مردے زندہ ہو کر کھڑے ہوں گے،آفت،مصیبت

قید۔بندش،اسیری،ممانعت

قید خانہ۔زندان،قیدیوں کو رکھنے کی جگہ

قیدی۔سزایافتہ،گرفتار

قیس۔لیلی کا عاشق

قیطون۔زری اور ریشم کی بنی ہوئی ڈوری

قیمت۔قدر،دام

قیمہ۔ریزریزہ کیا ہوا گوشت

کاج۔کرتے،قمیص،کوٹ وغیرہ میں بٹن لگانے کا سوراخ۔

کارخانہ۔چیزوں کو بنانے اور تیار کرنے کا مقام

کاری گر۔ماہرفن،ہنرمند

کاظم۔غصہ پی جانے والا

کافر۔خدا کی وحدانیت اور رسول کی
نبوت کو نہ ماننے والا

کافور۔ایک نہایت تیز خوشبو کا سفید مادہ

کامیاب۔کامران،فتح مند

کان۔منبع،وہ جگہ جہاں قیمتی چیزیں جمع ہوتی ہیں
اور کھود کر نکالی جاتی ہے

کباب۔کوئلوں پر بھنا ہوا قیمہ

کپاس۔کپاس،بغیر صاف کی ہوئی روئی

کپتان۔فوج یا جہاز کا آفسر

کچہری۔عدالت،دربار

کچھوا۔سنگ پشت

کدو۔گھیا

کدورت۔آزردگی،بغض

کرار۔بھگانے والا،بار بار حملہ کرنے والا

کرامت۔کرشمہ،بڑائی،بزرگی،

کراما کاتبین۔وہ دو فرشتے جو انسان کے اعمال لکھتے رہتے ہیں

کرایہ۔مزدوری،کسی چیز کی اجرت

کربلا۔عراق میں وہ جگہ جہاں امام حسینؑ کو شہید کیا گیا

کرسی۔کرسی،چوکی

کروڑ۔سولاکھ

کشتی۔زورآزمائی

کشکول۔بھیک کی جھولی

کشمش۔سوکھے ہوئے انگور

کعبہ۔بیت الحرام،مکہ

کفار۔کافر کی جمع

کفارہ۔گناہ دھودینے والا

کفر۔بے دینی،ناشکر

کفن۔مردے کی چادر

کل۔تمام،سب

کلمہ۔بات،وہ بامعنی بات جو انسان کے منھ سے نکلے
توحید الٰہی اور نبوت محمد کا اقرار

کلنگ۔قاز،کونج،لمبی ٹانگوں والا آدمی

کمال۔پورا،سارا،لیاقت

کمبل۔اوڑھنی

کمخاب۔زربفت

کمینہ۔نیچ ذات کا،کم اصل

کنال۔۲۰ مرلہ کے برابر زمین کا ٹکڑا

کنجوس۔تنگ دل

کن فیکون۔ہوجا پس ہوگیا،مخلوق

کنگال۔مفلس محتاج

کوثر۔جنت کی ایک نہر

کوچہ۔تنگ راستہ،گلی

گاڑی۔اسباب لانے یا سامان لے جانے کی مشین

گلاب۔ایک خوشبودار گلابی پھول

گوبھی۔ایک ترکاری

گولی۔بندوق کی گولی،دوائی

گھڑی۔وقت،ساعت،وقت بتانے کا آلہ

گھنٹہ۔ساٹھ منٹ کا وقت

لاجواب۔چپ،خاموش،بےنظیر

لاچار۔مجبور محتاج

لتہ۔گودڑ،کپڑا

لٹھا۔ایک قسم کا سفید سوتی کپڑا۔ل

لحاظ۔مروت،حمیت،شرم وحیا،ادب

لحد۔قبر

لفافہ۔وہ کاغذ کا غلاف جس میں خط،کاغذات وغیرہ بند کیے جاتے ہیں

ماتم۔سوگ،مصیبت

ماتم سرائے۔امام بارگاہ،غمکدہ

مبارک۔تہنیت،مرحبا،نیک

مبالغہ۔چھوٹی چیز کو بڑھا چڑھا کر بتانا

مثال۔نمونہ،نظیر

مثلا۔جس طرح،جیسے

مثنوی۔مثنوی

مجاہد۔کوشش کرنے والا،جہاد کرنے والا

متعلق۔وابستہ،تعلق رکھنے والا

مجبور۔بےبس،لاچار

مجتہد۔قرآن اور حدیث سے مسائل استنباط کرنے والا،صاحب اجتہاد

مجرم۔ملزم،جرم کرنے والا

مجلس۔جلسہ،مجمع

مجنون۔دیوانہ،پاگل

محاذ۔مقابل،میدان جنگ

محبّ۔پیار کرنے والا

محبت۔پیار،عشق،لگن

محتاج۔چاہنے والا،معذور

محراب۔لڑنے کی جگہ،مسجد میں امام کھڑا ہونے کی جگہ

محرم۔وہ شخص جس سے پردہ کرنا ضروری نہ ہو،ہمراز

محرم۔اسلامی سال کا پہلا مہینہ

محکمہ۔حکم کرنے کی جگہ،عدالت

محمد۔رسول خدا کا اسم مبارک

مخالف۔برعکس،الٹا،دشمن

مختار۔وکیل،سربراہ کار،مجاز،بااختیار

مختارنامہ۔وہ دستاویز جس کے رو سے کسی کو مجاز یا بااختیار بنایا جائے

کنایہ۔رمز،اشارہ

مخمل۔ایک قسم کا سرخ اور نہایت ملائم پھول یا کپڑا

مدت۔زمانہ،عرضہ

مدح۔ثناء،ستائش،تعریف

مدد۔امداد،کمک

مدرسہ۔سکول،علم حاصل کرنے کا مقام

مدعی۔دعویدار

مذہب۔دین وایمان،طریقہ

مذی۔وہ مادہ جو شہوت کے غلبہ سے خارج ہوتا ہے

مراد۔مقصد،آرزو،مفہوم

مرثیہ۔وہ نظم جس میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اوراس کی مصیبتوں کا ذکر ہو

مردار۔اپنی موت سے مرا ہوا جانور،ناپاک

مرہم۔وہ دوا جو زخم پر لگائی جاتی ہے

مزاج۔سرشت،خصلت

مزار۔درگا،زیارت کرنے کی جگہ،مقبرہ

مسافر۔سفر کرنے والا،پردیسی

مسجد۔مسلمانوں کا عبادت گاہ

مسلمان۔جس کا مذہب اسلام ہو

مشکل۔الجھا ہوا،پیچیدہ،سخت

مشکل کشا۔مشکل حل کرنے والا

مشورہ۔باہمی تجویز

مشہور۔نامی گرامی،نام ور،معروف

مشین۔پرزہ،گاڑی،بس وغیرہ

مطلب۔مقصد،خواہش

مظلوم۔ستم رسیدہ،جس پر ظلم ہوا ہو۔

معاد۔آخرت،قیامت

معاف۔درگزر،بخشا گیا

معافی۔رہائی،بخشش

معجزہ۔کرشمہ

معراج۔اعلیٰ رتبہ

معصوم۔پاکدامن،عصمت

معمولی۔حسب عادت،مروجہ

مغرب۔شام کا وقت

مغرور۔گھمنڈی،متکبر

مفت۔بے محنت،بے وجہ،بلاعوص

مفتی۔فتویٰ دینے والا

مقام۔ٹھکانا،گھر

مقدمہ۔استغاثہ،دعویٰ،مسئلہ،بات،تمہید،دیباچہ

مقرر۔مامور،تعینات،ٹھرایا گیا

مقرِر۔لیکچرر،تقریر کرنے والا

مکار۔دغاباز،فریبی،ہوشیار

مکر۔عیاری،ہوشیاری

مکروہ۔برا،خراب،ناپسند

ملا۔عالم،فاضل،پڑھا لکھا

ملازم۔خادم،پاس رہنے ولا

ملازمت۔نوکری،خدمت

ملاقات۔آنا جانا،باہمی صحبت،

ملکہ۔رانی

منت۔احسان،شکریہ

منظور۔قبول،مانا گیا،پسند

منع۔ناجائز،روکا گیا

موت۔مرجانا،فوت،اجل

مورچہ۔حصار،چھپ کر رہنے کا مقام

موزہ۔جراب،چمڑے کا بوٹ

موسم۔سماں،موقع،وقت

موقع۔خاص وقت،مناسب وقت

مولا۔سردار،آقا،مالک

موم۔بہت نرم

موم بتی۔شمع

مومن۔ایمان دار

مونگ پھلی۔مونگ پھلی

مہدی۔ہدایت کرنے والا،رہبر

مہر۔حق زوجیت

مُہر۔چھاپ

مہمان۔مہمان

میوہ۔ثمر،پھل

ناامید۔ناکام،بے آس

نابالغ۔کم سن،بچہ

ناپرسان۔لاپروا،پوچھنے والا نہ ہونا

ناحق۔بلاسبب،بے جا

نادان۔کچھ نہ جاننے والا،ناسمجھ

ناز۔غمزہ،غرور،بھروسہ

نازک۔باریک،کمزور،ہلکا

ناسزا۔نامناسب،غیر شائستہ الفاظ

نبوت۔احکام الٰہی کا پہنچانا،رسالت

نبی۔رسول،خبر پہنچانے والا

نثار۔قربان،بھینٹ

نثر۔وہ تحریر جو نظم نہ ہو

نجات۔رہائی،بخشش

نجس۔گندہ،ناپاک

نجف۔عراق کا ایک مشہور شہر

نحر۔اونٹ ذبح کرنے کا طریقہ

نحس۔بدشگوں،نامبارک

نخرہ۔معشوقانہ انداز،غمزہ

نذر۔نیاز،تحائف،تحفہ

نذرانہ۔ہدیہ،وہ چیز جو کسی بزرگ،مقدس یا با اختیار درگاہ میں پیش کی جائے۔

نرخ۔مول،قیمت،شرح

نرگس۔ایک خوبصورت اوخوشبودار پھول

نزاکت۔عشوہ،ناز وادا

نزلہ۔زکام

نشا۔مدہوشی، عادت، خمار

نشاتین۔دنیاوآخرت

نشاستہ۔مغزگندم

نشان۔یادگار، علامت، جھنڈا، سراغ

نشانہ۔مقام، پہچان، گولی یا تیر مارنے کی جگہ

نصاریٰ۔عیسائی

نصف۔نیم

نصیب۔قسمت

نصیحت۔ہدایت، نیک مشورہ

نصیری۔نصیر نامی ایک فرقہ سے منسوب

نطفہ۔نسل، اولاد

نطفہ حرام۔بدذات، ولدالزنا

نظر۔نگاہ، بصارت، مہربانی

نظم۔کلام موزوں

نظیر۔مانند، نمونہ، حوالہ

نعش۔لاش، میت

نعل۔پاپوش، کفش

نغمہ۔سریلی آواز، ترانہ، گیت

نف۔ذات، نفس

نفاق۔کینہ، بغض، عداوت، پھوٹ

نفرت۔ناچہنا، کراہت، گھن

نفسانفسی۔خودغرضی

نفع۔پھل، نتیجہ، فائدہ

نفل۔وہ زائد عبادت جو شکرانہ کی نیت سے کی جائے

نفقہ۔بال بچوں کا خرچ

نقاب۔برقع، گھونگھٹ

نقد۔روپیہ، پیسہ، سرمایہ

نقش۔شبیہ، صورت

نقشہ۔خط وخال، کسی جگہ کی ہیئت، تصویر

نقصان۔خسارہ، کوتاہی، زیاں

نقل۔اصل کی صد، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا

نکاح۔شادی، بیاہ، صیغہ تزویج

نل۔اندر سے کھوکھلی اور لمبی چیز، پائپ

نلی۔بندوق کی نلی وغیرہ

نم۔رطوبت، سویرا، روزی

نماز۔پوجا، عبادت، اہل اسلام کی عبادت

نوجوان۔نوخیز، نوعمر

نوحہ۔بین، ماتم

نور۔روشنی

نوروز۔نیادن

نوشیروان۔ایران کا ایک مشہور عادل بادشاہ، انصاف پسند

نوکری۔ملازمت، مشاہرہ

نیت۔مطلب، فرض، مقصد

نیزہ۔برچھی، بھالا

نیک۔پارسا، نیک چلن، اچھا

واجب۔ضرور، لازم

ہاتف۔سروش، غیب کی آواز دینے والے

ہاجرہ۔حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ہار۔ پھولوں یا موتیوں کی مالا

ہارون۔حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی کا نام

ہاشم۔قبیلہ بنی ہاشم، پیغمبر کے پردادا کا نام

ہامان۔فرعون کے ایک وزیر کا نام

ہتک۔بے حرمتی، بے عزتی، گستاخی، بے ادبی

ہتوڑا۔کوٹنے کا چھوٹا مارتول

ہتھ گڑی۔وہ ہنی کڑا یا زنجیر جو مجرم کے ہاتھ میں ڈالی جاتی ہے

ہتھیار۔کام کرنے کے آلات، اسلحہ، سامان

ہٹی۔دکان

ہجا۔الگ الگ اعراب کے ساتھ پڑھنا

ہجرت۔وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا، جدائی

ہجری۔وہ سن جو حضرت پیغمبرؐ اسلام کے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے شروع ہوتا ہے

ہجوم۔مجمع عام، بھیڑ بھاڑ

ہدایت۔پند و نصیحت، رہنمائی، رہبری

ہدیہ۔نذرانہ، قرآن شریف کی ہدیہ

ہڑتال۔کسی ماتم یا ظلم و ستم کے خلاف دکانیں اور دفاتر بند کرنا

ہضم۔معدے میں کھانا گلنا، چوری، غبن

ہوشیار۔باصلاحیت، دانشمند۔ا

مندرجہ بالا تمام الفاظ جو اردو اور فارسی زبان سے تعلق رکھتے ہیں بلتی زبان و ادب میں بھی اردو کے زیر اثر قبول کر لئے گئے ہیں۔ان الفاظ کے معنی بھی وہی ہیں جو فارسی اور اردو میں ہیں۔ یہاں ان الفاظ کی فہرست دینے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو سکے کہ اردو زبان و ادب کے اثرات کس طرح بلتی زبان و ادب پر غالب ہیں۔

☆☆☆

ا۔ان الفاظ کو راجہ محمد علی شاہ صباؔ کی کتاب ''بلتی، اردو لغت'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

(۔صباؔ، راجہ محمد علی شاہ؛ بلتی اردو لغت۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔۲۰۰۳ء)

باب چہارم

بلتی زبان کے معروف شعراء کی تخلیقات

اور

ان پر اردو کے اثرات

بلتی زبان کے معروف شعراء کی تخلیقات اوران پر اردو کے اثرات

دیگر زبانوں کی طرح بلتی زبان میں بھی اظہار خیال کے لئے پہلے شاعری کا ہی سہارا لیا گیا۔بلتی زبان میں شعری سرمایہ نثر کے مقابلے میں زیادہ ہے۔بلتستان کے معروف اسکالر جناب محمد حسن حسرتؔ نے بلتی ادب کو مختلف شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کچھ اس طرح ہیں۔بلتی ادب کے دو حصے،لوک ادب اور تحریری ادب اس کے بعد لوک ادب کے دو حصے،منظوم لوک ادب اور نثری لوک ادب۔منظوم لوک ادب کے چھ حصے، رگیا نگ خلو، زدرونگ خلو، دیوان (برخلو)، ہرژے خلو، یورمی خلو، رداحسی خلو۔نثری لوک ادب کے تین حصے،لوک داستان،لوک کہانی،ضرب المثال ومحاورے اور تحریری ادب کے بارہ حصے کئے گئے ہیں۔ان میں حمد،نعت،قصائد،مراثی ونوحہ جات،بحر طویل، گوشوارہ، غزل، شہرآشوب،منظوم ترجم،ملی نغمہ،زرعی نغمےاور ریڈیائی ڈرامے ہیں۔

منظوم لوک ادب اور تحریری ادب کے حوالے سے اس باب میں بحث کی گئی ہے اور نثری لوک ادب کی وضاحت اگلے باب میں کی جائے گی۔محمد حسن حسرتؔ منظوم لوک ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’قدیم زمانہ میں شعروشاعری کے لئے بلتی زبان میں خلو کہا جاتا تھا جو آج کل عرفاً صرف غزل اور گانے کے لئے مخصوص ہے۔حکمرانوں یا محبوب کی تعریف وتوصیف کوستودخلو، مذمت کا مضمون ہو تو بوک خلو اور کسی کے دکھ درد میں کہا گیا ہو تو ھرژیک خلو کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بزرگ دانشور غلام مہدی کے مطابق اسلام کے یہاں آنے کے بعد پہلے پہل مذہبی اشعار کو بھی بلتی میں خداپی خلو،نعت کو رسول پی خلو اور قصائد کو امام پی خلو کہا جانے لگا۔جب رفتہ رفتہ مبلغین اور علماء کے ذریعے فارسی درس وتدریس اور شاعری کا آغاز ہوا تو حمد،نعت،قصیدہ،مرثیہ،نوحہ،بحر طویل اور گوشوارہ کی اصطلاحات کو بلتی شاعری میں بھی استعمال کرنا شروع کردیا گیا۔لفظ خلو صرف غزل اور عشقیہ گانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔جو آج بھی رائج ہے۔یہ کہنا دشوار ہے کہ بلتی شاعری کب اور کہاں سے شروع ہوئی۔البتہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شاعری بغیر ردیف قافیہ کے اشعار سے شروع ہوئی۔جیسے انگریزی ادب میں اسے verses کہتے ہیں۔اس قافیہ ردیف سے مبرا اشعار کو بلتی میں ’’رگیا خلو‘‘ اور اردو ادب میں لوک گیت کہتے ہیں لفظ’’رگیا‘‘ بلتی زبان میں بڑے کو کہا جاتا ہے۔جیسے رگیالفو(بادشاہ) رگیالمو(رانی) رگیا یل(بڑی بستی) وغیرہ۔اس طرح بڑے بڑے واقعات جو نظم کی شکل میں مقبول ہوئے ہیں۔اسے بلتی ادب میں ’’رگیا خلو‘‘یعنی لوک گیت کے نام سے پکارا گیا ہے۔جو کثرت استعمال سے گیا نگ خلو کہا گیا۔اسکے علاوہ بلتی منظوم ادب میں زدرونگ خلو، برخلو(دیوان) ہرژے خلو، رداحسی خلو کے نادر نسخے موجود ہیں‘‘[1]

۱۔حسرتؔ،محمد حسن؛ تاریخ ادبیات بلتستان، ٹی ایس پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی،نومبر ۱۹۹۲ء،ص:۵۳،۵۴

یہاں تحریری ادب سے مراد وہ شعری اصناف ہیں جو ۱۸۴۰ء کے بعد وجود میں آئیں۔یعنی ۱۸۴۰ء کے بعد بلتی ادب میں شاعری کے حوالے سے باقاعدہ تحریری ادب کا آغاز ہوا۔

بلتستان جس طرح لوک ادب میں وسیع سرمایہ رکھتا ہے اسی طرح تحریری ادب کے لحاظ سے بھی یہ ثروت مند رہا ہے۔ جو زیادہ تر شاعری کی شکل میں دستیاب ہے۔زمانہ قدیم میں یہاں داستان کیسر، بدھ مت کی مذہبی کتابیں اور علم طب کو بلتی کے نثری زبان میں تحریر کیا جاتا تھا۔لیکن جب سے یہاں کے لوگوں نے اپنے اصل رسم الخط کو چھوڑا اور اس کی جگہ فارسی رسم الخط کو اپنایا تب سے نثری ادب تخلیق پذیر نہیں ہوا، البتہ ترجمہ کا کام تھوڑا بہت ہوتا رہا جن میں معروف قصیدہ گو شاعر سید عباس کی تحریر کردہ متی کی انجیل کا بلتی ترجمہ ''کھوم لوکھسی لم'' اور شیخ جعفر کا ۱۳۸۹ ہجری میں کیا ہوا ترجمہ قرآن کا قلمی نسخہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بلتستان میں اشاعت اسلام کے بعد اجتماعی فکر پر مذہب سے والہانہ عقیدت کا عنصر سب سے زیادہ غالب رہا ہے۔اس وجہ سے یہاں کی شاعری زیادہ تر اسی جذبہ عقیدت سے عبارت ہے۔اگر چہ دیگر اصناف سخن میں یہاں کے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔تاہم مجموعی طور پر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہاں کا تحریری ادب زیادہ تر مذہبی موضوعات و مسائل پر مشتمل ہے۔ چونکہ بار بار ذکر ہو چکا ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کی تبلیغ ایرانی مبلغین کے ذریعے ہوئی جنہوں نے اس علاقے کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا جس کے سبب یہاں کے رہن سہن، رسم و رواج اور شاعری و موسیقی پر ایرانی ادبیات و فنون کا گہرا رنگ چڑھ گیا بلکہ بلتستان کے چند شعراء نے بلتی شاعری کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی۔

۱۸۴۰ء سے قبل کا بلتی ادب زوالِ بلتستان کے بعد ڈوگرہ استبداد کی نذر ہو گیا۔لہٰذا اس دور کا شعری ادب یہیں اختتام پذیر ہوتا ہے۔تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے شعری ادب کے نمونے فارسی میں قلمی منظوم شعر نامہ اور دیوان تحسین کے نسخے موجود ہیں۔علاوہ ازیں اس دور کا کوئی بلتی شعری نمونہ لوک ادب کے علاوہ دستیاب نہیں ہے۔

جب ۱۸۴۰ء میں بلتستان کی آزادی ڈوگروں کی غلامی میں بدل گئی تو پورے بلتستان کے معاشرے میں غم و یاس کا ماحول پیدا ہوا۔اہل قلم نے ان کے خلاف احتجاج کا اظہار اشعار کی صورت میں کیا۔۱۸۴۰ء تا ۱۹۴۸ء کے عرصے میں بلتستان میں کئی بڑے نامور شاعروں اور ادیبوں کی کھیپ ملتی ہے جس سے یہاں کے ادب کو فروغ ملا یہیں سے جدید بلتی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ جو ۱۸۴۰ سے تا حال قائم ہے۔ جسے تین ادوار دور متقدمین، دور متوسطین اور دور حاضر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسن حسرتؔ نے شعرا بلتستان کو تین ادوار میں تقسیم بندی کی ہے وہ اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات بلتستان'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

'بلتستان کے شعراء کو میں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور مقدمین میں صرف وہی شعرائے راجگان شامل ہیں جو ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۲ء کی شورشوں میں ڈوگروں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے تھے۔ دور متوسطین میں باقی شعرائے مرحومین کو جگہ دی ہے۔ البتہ ان کا تاریخی ادوار میں فرق ضرور ہے۔ اور دور جدیدان شعراء وادیبوں کے لئے وقف رکھا گیا ہے۔ جو اس وقت بقید حیات ہیں''۔

(تاریخ ادبیات بلتستان، ص:۱۶)

حاجی فدا محمد ناشاد شعر وشاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''شاعری نہایت ہی لطیف صنف سخن ہے۔ اگر کسی زبان کو گلاب سے تشبیہ دیں تو شاعری اس گلاب کی خوشبو ہے۔ زبان وادب کے جسم کے لئے شاعری جان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر شاعر کیا ہے۔ اس کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے ؎

شاعر اندر سینہء ملت چو دل

ملت بے شاعری انبار گل

زبان اور ادب کے حوالے سے بات کی جائے تو اکثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے ان میں وقت اور حالات کے تحت تبدیلیاں نمو پاتی رہتی ہیں۔ زبان وادب میں ہونے والے تغیر اور ان پر اثر انداز ہونے والے محرکات کے بارے میں محمد ناشاد صاحب لکھتے ہیں:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر زبان ہمیشہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ آج ہم اپنی قومی زبان اردو کو دیکھیں تمام وسائل وذرائع کے باوجود یہ وہ نہیں جو قلی قطب شاہ، فائز دہلوی اور ولی دکنی کے دور میں تھی۔ قدیم فارسی صرف قدیم کتابوں میں ہی مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ غرض ہر زبان ماحول اور گردوپیش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(بلتستان کے سخنور، شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار، سکردو، ۱۹۹۳ء، ص:۲۲،۲۳)

موجودہ دور میں بلتستان کے ننانوے فیصد لوگ اردو جانتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اردو زبان کا استعمال فخریہ طور پر کرتے ہیں۔ بلتستان میں اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی تعلیم کا رواج عام ہے۔ یہاں کی مقامی زبان میں آوازوں کی تعداد دیگر زبانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اردو سیکھنے کے بعد یہاں کے لوگوں کا لب ولہجہ صاف اور شستہ، تلفظ حد درجہ درست اور انداز بیاں دلکش ہوتا ہے۔ ویسے بھی سینکڑوں سال قبل سے بلتستان کی تہذیب و ثقافت اور زبان وادب کا رشتہ فارسی اور اردو زبان سے مستحکم رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے لوگ اردو کے تئیں والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں حشمت علی کمال الہامیؔ لکھتے ہیں:

''دنیائے اردو کے نامور شاعر احمد فراز جب سکردو مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تو یہاں کے مثالی ماحول، علم و ادب اور مشاعرے کے ساتھ ان کا والہانہ عشق دیکھ کر انھوں نے کہا تھا کہ میں دنیا کے خوبصورت علاقوں اور خطوں میں جا چکا ہوں لیکن سکردو کی طرح حسین خطہ اور سکردو والوں کی طرح ادب نواز لوگ میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ انہوں نے کہا جس طرح یہ علاقہ خوبصورت ہے اس سے کہیں زیادہ یہاں کے لوگوں کے خیالات خوبصورت ہیں''۔ا

بلتستان میں فروغ اردو کا سلسلہ گذشتہ کئی دہائیوں سے جاری وساری ہے۔ اس دوران بلتستان سے بڑی تعداد میں لوگ حصول علم، تلاش روزگار، سیر و سیاحت اور دیگر ضروریات کے سلسلے میں اردو کے اہم مراکز، لکھنؤ، دہلی، امروہہ، میرٹھ، مراد آباد، شملہ، کراچی، لاہور حیدر آباد اور خیر پور وغیرہ گئے اور وہاں سے اردو زبان و ادب سے مالا مال ہو کر بلتستان واپس آئے۔

بلتی شاعری کا ڈھانچہ اردو پر قائم ہے۔ بلتی میں اردو اصناف سخن جیسے غزل، قصیدہ، مرثیہ، نعت، مثنوی، قطعہ اور رباعی کا چلن ہے اور یہ اصناف عوام الناس میں مقبول ہیں۔ بلتی شاعری میں اردو فن عروض جیسے قافیہ پیمائی، بحر اور وزن کے قواعد کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں کے شعراء کے کلام میں اردو کے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔

بلتی زبان ایک سائنو تبتو زبان ہے اس کے بارے میں دوسرے باب میں تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ اس زبان کا رسم الخط پہلے تبتی رسم الخط تھا بعد میں تقریباً چودھویں پندرھویں صدی میں فارسی رسم الخط کو اپنایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ خطہ لداخ اور بلتستان میں چودھویں، پندرھویں صدی میں مسلمان مبلغین کی آمد کے بعد لداخ و بلتستان کی تہذیب و ثقافت پر دور رس اثر پڑا۔ ایک طرف مذہبی اعتبار سے دوسری طرف سیاسی طور پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس زمانے میں پورے برصغیر میں فارسی زبان عروج پر تھی۔ ہندوستان میں فارسی زبان کو راج دربار اور سرکاری زبان کی حیثیت ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ فارسی زبان کا اثر پورے خطے پر بھی پڑا۔

لداخ اور بلتستان میں قدیم ادبیات پر اردو ادب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ انیسویں صدی کے بعد بلتی ادب ابتدائی حالت سے عروج کی طرف رواں دواں ہوا۔ اس دور کے ادب میں ہمیں غزل، قصیدہ، مرثیہ، نوحہ، شہر آشوب، بحر طویل و دیگر اصناف ملتی ہیں۔

یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں:۔

'بلتستان میں سرما کی لمبی راتوں میں کہانیاں سننے سنانے کا رواج عام رہا ہے۔ ان کہانیوں میں جب کسی کردار کے

ا۔ (کمال الہامی، پروفیسر، حشمت علی؛ نگارشات بلتستان، بلتستان دائرہ نگارش، سکردو، سودے بکس پبلیشر بک سیلر سپلائر علمدار روڈ، سکردو، ۲۰۰۵ء، ص: ۵۷)

بارے میں جذبات کے اظہار کا مقام آتا ہے تو اسے منظوم صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔اس قسم کی نظموں کو زدرونگ خلو یعنی نظم کہانی کہا جاتا ہے۔اس میں عموماً قافیہ اور ردیف ملحوظ رکھے جاتے ہیں مگر اوزان کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ بدھ مت کے دور میں مذہبی تعلیمات سے متعلق بلتی نظمیں موجود تھیں جو بودھ خلو کہلاتی تھیں۔اشاعت اسلام کے بعد یہ صنف معدوم ہوچکی ہے۔رگیانگ خلو، زدرونگ خلو اور بودھ خلو کے علاوہ دیگر نظمیں خلو کہلاتی تھیں۔اس قسم کی نظموں کو ان کے واضع یا موضوعات سے منسوب کیا جاتا تھا''۔ا

چودھویں، پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں بلتستان (تبت خورد) اور پرگ میں مسلمان مبلغوں کی کاوشوں سے اسلام پھیلا۔اس مذہبی انقلاب کی بنا پر بلتستان و پرگ کا تبت کے ساتھ مذہبی تعلق تقریباً ختم ہوگیا، اب مذہب کے میدان میں ان کا سرچشمۂ فیض تبت نہیں بلکہ ایران وعرب ہوگیا۔اسی طرح علم وادب اور فنونِ لطیفہ کے میدانوں میں بھی ایران وعرب کا تتبع کیا جانے لگا، تبتی ادب کی جگہ فارسی ادب نے اور تبتی رسم الخط کی جگہ فارسی رسم الخط کو فروغ ملا۔فارسی زبان ہندوستان میں پٹھانوں اور مغلوں کی بھی زبان تھی۔جن کے ساتھ ان کے قریبی سیاسی تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔اسی طرح شعروشاعری کے میدان میں فارسی شعراء کی تقلید اور فارسی طرز کی غزل گوئی پسند کی جانے لگی اور لوگوں کی زباں پر عربی ادب اور فارسی ادب کے معروف اور مثالی کرداروں مثلاً یوسف زلیخا، شرین فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کے نام چڑھنے لگے۔اسی طرح قصے کہانیوں اور رزمیہ کے میدان میں لِنگ کیسر رگیالپو، درپون، اپی سو وغیرہ کے ساتھ ساتھ رستم وسہراب، اسفندیار اور جناب امیر حمزہ وغیرہ کے نام اور بانیانِ مذہب اور علمائے دین کے تذکروں میں مشاہیر اسلام کے اسمائے گرامی بھی آنے لگے۔اسی کے ساتھ نام والقاب، رسم ورواج، اصول وعقائد اور سماجی وتہذیبی قدروں میں انقلاب آنے لگا۔بلتی شعراء اپنی زیادہ توجہ مذہبی عقیدت کی بنا پر حمد ونعت پر دینے لگے۔خدائے بزرگ و برتر کی حمد وثناء میں فارسی طرز کی منظومات اور انبیاء کرام واولیاء اللہ اور معصومینؑ کی شان میں قصائد ومناقب اور شہدائے کربلا یعنی سیدالشہداء امام حسینؑ اور ان کے اہل بیت وانصار کی شان میں مرثیے، نوحے اور سلام بلتی زبان (جو تبتی زبان کی ایک ''شاخ'' شکل ہے) میں لکھے جانے لگے۔ان شعراء میں راجہ امیر حیدرؔ، بابا جوہرؔ، مرادؔ شگری، محبّؔ، راجہ حاتم خان بیگوؔ، بابا اسفندیار، سید منصور علی منصورؔ، مولوی عباس شگری، وغیرہ کا شمار قدیم شعراء میں ہوتا ہے۔موجودہ شعراء میں شمیم بلتستانی، محمد علی واحدؔ وغیرہ مقبول ومعروف ہیں۔شمیم بلتستانی نعتیہ کلام کے علاوہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔کرگلی شعراء میں شیخ غلام حسین مرحوم اقچہ مل کا نام قابل توجہ ہے۔مرحوم مرثیہ نگار تھے۔حال ہی میں شیخ غلام حسین صاحب کرکت

ا۔تاریخ بلتستان، ص:۳۳۶

ساکن کرکت چھونے شعرائے بلتستان کا منتخب کلام (قصائد، مراثی اور نوحے) کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ان کی یہ خدمت بلتی زبان کے لئے سرمایۂ گراں قدر ہے۔

دورِ حاضر کے بلتستانی شعراء اور ادیب کلاسیکی ادب اور قدیم لوک ادب کی تاریخی روایت اور ان کی اہمیت کا قوی احساس رکھتے ہیں اور ان کا تحفظ چاہتے ہیں۔ بلتستان میں رگیانگ لہوؤں کا بہت بڑا ذخیرہ پایا ہے۔ جو قدیم تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ ریڈیو پاکستان سے بلتی پروگرام کے دوران نعتیہ کلام اور مراثی کے علاوہ رگیانگ لہو، دیوان، غزلیں اور راگ وغیرہ بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی نوع کی کدوکاوش لداخ میں بھی ہورہی ہے۔ لداخ کے موجودہ شعراء میں کچھ شعراء قومی یک جہتی، حب الوطنی، وطن دوستی، تعمیر وترقی، تعلیم وتربیت وغیرہ موضوعات پر جدید طرز پر خالص لداخی زبان میں ڈرامے، نظمیں اور گیت (جن کا آہنگ تبتی ابرو سے ملتا جلتا ہے) لکھ رہے ہیں۔ پوریگ اس لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی کوششوں کی ضرورت ہے۔ بقول کاچو سکندر خان سکندرؔ:

'' بلتستانی شعراء کے کلام میں اچھی خاصی بالغ نظری اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ جوہرؔ، مولوی عباس، راجہ امیر حیدرؔ۔ راجہ حاتم خان اور شمیم بلتستانی کا کلام کہیں کہیں بلندیوں کو چھو جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان شعراء کا کلام لداخی ادب عالیہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ بلتستانی ادیب لداخی ادب کو عرب وعجم کی شعری ونثری روایات سے روشناس کرتے آئے ہیں''۔

(قدیم لداخ، تاریخ وتمدن، ص:۶۰۶)

اولاً بلتی زبان میں منظوم کلام کو 'خلو' کہا جاتا تھا۔ اس وقت بلتی شاعری کی رگیانگ خلو، زدرونگ خلو، بودھ خلو اور خلو چار اصناف تھیں جن میں رگیانگ خلو کو اولیت کا شرف حاصل تھا۔ اسی لئے اسے رگیانگ خلو یعنی نظموں کا سردار نام دیا گیا تھا۔ رگیا، سابقہ ہے جو اولیت وعظمت کے لئے مستعمل ہے۔ رگیانگ خلو ایک قسم کی آزاد شاعری ہے۔ جس میں اوزان اور قوافی کی پابندی کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ اس کے ابتدائی شعر یا ابتدائی شعر کے دوسرے مصرع کو کبھی کبھی ہر بند کے بعد مکرر پڑھا جاتا ہے۔ اس کے موضوعات میں تاریخ، رزم و بزم، حسن وعشق، آہ و بکا، مدح اور ہجو وغیرہ شامل ہیں۔ رگیانگ خلو کا استعمال خفیہ پیغام رسانی کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ بلتستان میں سرما کی لمبی راتوں میں کہانیاں سننے سنانے کا رواج عام ہے۔ ان کہانیوں میں جب کسی کردار کے بارے میں خاص قسم کے جذبات واحساسات کے اظہار کا موقع آتا ہے تو اسے منظوم صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں کو 'زدرونگ خلو' یعنی نظم کہانی کہا جاتا ہے۔ اس میں عام طور پر قافیہ اور ردیف ملحوظ رکھے جاتے ہیں مگر بحور واوزان کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بدھ مت کے دور میں مذہبی

تعلیمات اور اصول سے متعلق بلتی نظمیں موجود تھیں جنھیں 'بودھ خلو' کہا جاتا تھا۔ اشاعت اسلام کے بعد یہ صنف معدوم ہوگئی۔ رگیانگ خلو، زدرونگ خلو اور بودھ خلو کے علاوہ دیگر نظمیں خلو کہلاتی تھیں۔ اس قسم کی نظموں کو ان کے واضع یا موضوعات سے منسوب کیا جاتا تھا۔

لداخ اور بلتستان میں چودھویں اور پندرھویں صدی میں کئی سطحوں انقلابات رونما ہوئے۔ ان سے صنعتی، فکری اور مذہبی طور پر لوگوں میں تبدیلی آئی۔ یہاں کے ادب میں اس کے اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔

یوسف حسین آبادی کے مطابق:۔

''اشاعت اسلام نے نئے موضوعات فراہم کئے۔ چناچہ بلتی شاعری میں قصیدے (حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول مناقب آئمہ و اولیاء) مرثیے، نوحے، گوشوارے (مثنوی) بحر طویل، ہجو، دیوان، قطعات تاریخ اور فرد کی نئی اصناف ایجاد ہوگئیں۔ ابتدائی ایام میں مذہبی نظمیں خدا پی خلو، رسول پی خلو، امام پی خلو وغیرہ کی طرح کے ناموں سے معروف تھیں۔ لیکن بعد میں خلو کا نام صرف گانوں، عشقیہ غزلوں اور دواوین کے ساتھ مختص ہوگیا''۔۲

اردو ادب میں قصیدہ اکثر امراء کی تعریف و توصیف میں لکھا گیا ہے لیکن بلتی ادب میں اس طرح کی کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی بلکہ یہاں قصیدے صرف اور صرف حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول، مناقب آئمہ و اولیاء کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ بلتی ادب کی اصناف شاعری کی ہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں:

ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے بلتی قصیدے، مرثیے، نوحے ہجو اور خلو عموماً اردو غزل کی صورت میں ہوتے ہیں جن میں پہلا شعر مطلع ہوتا ہے۔ اور باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیہ یا قافیہ و ردیف دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن نعت، مناقب اور نوحے کبھی مسمط مثلث، مربع، مخمس اور مسدس صورتوں میں اور کبھی ترکیب بند اور ترجیع بند کی شکلوں میں بھی ہوتے ہیں۔ نوحے گاہے مستزاد بھی ہوتے ہیں۔ جدید بلتی نوحے اکثر غزل کے اصول پر ہی لکھے جاتے ہیں۔ گوشوارے مثنوی ہوتے ہیں۔ جن میں ہر شعر الگ قافیوں میں مگر ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مثنوی میں عام طور پر قصہ، واقعہ، تاریخ، منظر جنگ وغیرہ کی طرح کے طویل مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ بحر طویل میں ان کے علاوہ پند و نصیحت کے مضامین بھی بیان ہوتے ہیں۔ بحر طویل کی نظمیں طویل بحروں میں ہوتی ہیں۔ ہر بند الگ اوزان اور الگ قافیوں میں ہوتا ہے جو درجنوں مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مصرعے آپس میں کلی طور پر یا جزوی طور پر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخری

۱۔ آبادی، محمد یوسف؛ تاریخ بلتستان، بلتستان بکڈپو نیا بازار، سکردو، ۲۰۰۳ء، ص:۳۳۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۳۶/۳۳۷

مصرعے کے پیچھے ''را'' کا لفظ بطور ردیف لایا جاتا ہے۔مثنوی اور بحر طویل کے تمہید، گریز، مدعا اور خاتمہ چار حصے ہوتے ہیں۔ جو منظوم کلام رگیا نگ خلو اور گانے کے درمیان گایا جاتا ہے۔بلتی میں اسے دیوان یا بری خلو کہتے ہیں۔ساخت کے اعتبار سے یہ غزل کی طرح ہوتا ہے۔تاریخی قطعات رباعیات اور فرد کی صورتوں میں ہوتے ہیں۔دیگر مضامین پر بھی رباعیات اور فرد اشعار بہت ملتے ہیں۔جدید شعراء کے کلام میں عشقیہ اور مذہبی اشعار کے علاوہ دیگر مضامین پر بھی غزلیں ملتی ہیں۔

ہیئت اور ساخت کے علاوہ معنویت کے اعتبار سے بھی بلتی شاعری انتہائی ترقی کے منازل طے کر چکی ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے سارے اصول کارفرما نظر آتے ہیں ہے''۔۱

بلتستان اور لداخ میں جیسے ہی اسلامی تعلیمات کا رواج عام ہوا، مذہب اسلام کا رنگ زبان و ادب پر حاوی ہو گیا۔اس وقت سے خلو یا غزل کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوئی۔اس حوالے سے یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں۔

''معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام کے بعد کوئی نیا زدرد نگ خلو وجود میں نہیں آیا اور اس صنف کی جو نظمیں ہمارے درمیان موجود ہیں وہ صدیوں پرانی ہیں۔ان کے شعراء کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی تفصیل موجود نہیں۔یہی حال پرانے خلو کے شعراء کا بھی ہے۔ جہاں تک رگیا نگ خلو کے شعراء کا تعلق ہے انہی نظموں میں موجود ناموں، واقعات اور قرائن سے شعراء کے بارے میں اجمالی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔صرف چند ایک رگیا نگ خلو کے شعراء کے بارے میں تاریخی طور پر مختصر معلومات دستیاب ہیں۔خلو اور رگیا نگ خلو کے شعراء میں بہت سی شاعرہ خواتین بھی نظر آتی ہیں''۔۲

بلتی شاعری کا پہلا دور یا دور متقدمین ۱۸۴۰ء میں ڈوگروں کے بلتستان پر تسلط قائم کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔اس دور کے مشہور شاعر میر نجم الدین ثاقب کا نام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے فارسی میں منظوم تاریخی کتاب ''شعر نامہ'' لکھی۔۱۱۴۸ھ (۱۷۳۶ء) سے قبل انہوں نے اپنی دوسری منظوم تصنیف ''فصل الخطاب'' مکمل کی۔ سید ابوالحسن تحسین (متوفی ۱۷۷۶ء) نے بھی اسی دور میں فارسی میں اپنا دیوان ''سفینۃ التحسین'' لکھا جو آج 'دیوان تحسین' کے نام سے موجود ہے۔بلتی شاعری کا دوسرا دور ۱۸۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔

صادق ہرداسی کے بقول:۔''بلتی معاشرے میں اشاعت اسلام کے بعد اجتماعی فکر پر مذہب سے والہانہ عقیدت کا عنصر سب سے زیادہ غالب رہا ہے۔اس وجہ سے یہاں کی شاعری زیادہ تر اسی جذبہ عقیدت سے عبارت ہے۔غزل، شہر آشوب، قطعات، زرعی نغمے اور منظوم تراجم کے علاوہ یہاں کے شعراء نے جن اصناف اور موضوعات پر طبع آزمائیاں کی ہیں وہ مجموعی طور پر دین سے متعلق اصناف مثلاً حمد، نعت، منقبت در شان اہل بیت، مراثی و نوحہ جات، مثنوی، بحر

۱۔تاریخ بلتستان، بلتستان بکڈپو نیا بازار، سکردو۔ ص ۳۳۶/۳۳۷ (۲) ایضاً

طویل اور مناجات وغیرہ ہیں''۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ بلتی میں باقاعدہ شاعری کب اور کن حالات میں شروع ہوئی۔ البتہ ۱۸۴۰ء سے قبل سوائے لوک گیتوں کے بلتی زبان میں باقاعدہ شاعری اور کسی مستند شاعر کا سراغ نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ مقپون ظفر خان (۱۷۷۲ء تا ۱۷۶۵ء) کے دور میں سکردو کے قلعہ کھرپوچو کی سات منزلہ عمارت کو آگ لگنے سے شاہی کتب خانہ جل گیا اور سبھی ادبی شہ پارے نذر آتش ہو گئے۔ بچا کھچا مواد یقیناً سقوط بلتستان کے بعد ڈوگرہ استبداد کی نذر ہو گیا۔ لہذا اس دور کا شعری ادب وہیں اختتام پذیر ہو گیا۔

ڈوگرہ راجاؤں کا بلتستان پر قبضہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا۔ بلتستان میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر نت نئی تبدیلیاں آئیں۔ صادق ہرداسی اس سیاق میں لکھتے ہیں:

۱۸۴۰ء کا یہ انقلاب اور اس کے ہمہ گیر اثرات نہ صرف بلتستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں بلکہ بلتی ادب کا ایک اہم موڑ بھی ہے۔ ایک طرف عوام پر حسرت و یاس کا عالم طاری تھا اور دوسری جانب فتح و نصرت کے نشے میں سرشار ڈوگرہ افواج اور اس کے حامی ظلم و ستم کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ بلتی شاعروں نے اس کے جاں گسل اور پرآشوب وقت میں اپنے فکر وفن کو لالہ وگل کی ترجمانی، بلبل کی ہم زبانی اور دل کی رام کہانی جیسے روایتی موضوعات تک محدود نہیں رکھا۔ حسن و عشق کے راگ الاپنے والے مقپون اور اماچا کے شہزادے جب دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو گئے تو حمد، نعت اور منقبت آلِ محمد کے علاوہ مراثی کے حوالے سے اپنے اشعار میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کی جھلکیاں دکھانے لگے۔ بلتستان کے ان شہزادوں نے اپنے خاندانی جاہ و ثروت کے چراغ کو خود اپنی آنکھوں سے بجھتے دیکھا تھا اور عیش و عشرت کی محفلیں آنکھ جھپکنے میں اُجڑتے دیکھی تھیں۔ چنانچہ اس تاریخی الٹ پھیر سے ایک نئی تہذیب معرض وجود میں آئی جس کے اثرات ادب میں رونما ہونا لازمی تھے نتیجتاً بلتستان میں علم و ادب کے بڑے بڑے چشمے پھوٹ پڑے اور بلتی شاعری کے افق پر کئی روشن ستارے حیدر خان حیدر اماچہ جذبہ حب الوطنی میں سرگرداں نہ صرف حریت و آزادی کا پیغام دینے لگے بلکہ وہ گلاب سنگھ کی قید میں رہ کر اس کی ہجو گوئی کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف مقپون شہزادے اور احمد شاہ کے بیٹے حسین علی خان محبؔ، لطف علی خان عاشقؔ، ملک حیدر مخلصؔ اور امیر حیدر محزون اور ان کے بیٹے محمد علی خان ذاکرؔ اپنے دکھ درد کی داستان کو واقعہ کربلا کا سہارا لے کر مرثیہ نگاری کے ذریعے اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح مراد خان مرادؔ اماچا ایک طرف محمد کی مدح گوئی میں رطب اللسان ہیں اور دوسری طرف معاملات حسن و عشق کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے اور تغزل کی شان بڑھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔[۱]

۱۔ ہرداسی، محمد صادق؛ بلتی ادب، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۷ء، ص: ۲۶۵

بلتی ادب کی اصناف سخن۔حمد،نعت،قصیدہ،مرثیہ ونوحہ،بحرطویل، گوشوارہ (مثنوی)،غزل،شہرآشوب،منظوم تراجم،زرعی نغمہ،وغیرہ ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانی فکرارد گرد کے ماحول کے زیراثر رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔شاعری انسانی افکاروخیالات کے منظّم اظہار کا ایک مرغوب ذریعہ ہے۔اس لحاظ سے شاعری بھی سیاسی،سماجی اور مذہبی ماحول کے اثرات سے عاری نہیں رہ سکتی۔یہی سبب ہے کہ مختلف قوموں میں شاعری کے موضوعات اور اصناف مختلف بلکہ بسا اوقات متضاد بھی رہے ہیں۔بلتستان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ صاف طور پر نظر آتا ہے کہ اشاعت اسلام کے بعد یہاں کی شاعری موضوعات کی سطح پر اپنا مخصوص رنگ وآہنگ رکھتی ہے۔شاعری کے اکثر و بیشتر مضامین اسلامی جذبۂ عقیدت کے اظہار سے سرشار ہیں۔محمد حسن حسرت لکھتے ہیں:

''کسی بھی قوم کے انداز فکر وعمل، مذہبی ارتقاء اور تہذیب وتمدن کا مرقع اس کا ادب ہوتا ہے۔ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں۔الحمدللہ بلتستان کا معاشرہ ادب کے لحاظ سے بہت امیر ہے جو زیادہ تر مذہبی شاعری کی صورت میں دستیاب ہے۔''

بلتی زبان کی تحریری شاعری کو ہم بارہ اصناف میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

حمد:۔خدا کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو حمد کہتے ہیں۔حمد عربی لفظ ہے جس کا معنی تعریف ہے۔لیکن یہ ہر کسی کی تعریف کے لئے مستعمل نہیں بلکہ یہ خدائے عزوجل کی تعریف کے لئے مختص ہے۔خدائے تعالی کی صفات پر مبنی اشعار کو حمد کہا جاتا ہے،جس کا رواج دنیا کی تقریباً ہر زبان اور خطے میں ہے۔بلتی زبان وادب میں یہ صنف فارسی شاعری کے توسط سے آئی ہے۔بلتی ادب میں اس صنف سخن کا مقام ومرتبہ بلند ہے۔بلتی میں حمد باری تعالی منقبت کی طرح رواں بحروں اور مثنوی کی صنف میں وافر تعداد میں دستیاب ہے۔اس کے علاوہ یہاں کے شعراء بحرطویل صنف کا آغاز اکثر حمد باری تعالی سے ہی کرتے ہیں۔

نا س حمد و ثنا خا لق ا کبر پو لا بین یو د

بخشس یانی بیوس زیرینانیسپو نگ رانی ہرژین یود۔ا (موسوی)

اس شعر میں حمد،ثنا،خالق،اکبر،بخشش،جیسے اردو/فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ا۔امبہ،سید حسین موسوی؛ نوائے حق،حسینی الفلاح سوسائٹی امبہ شعبہ نشرواشاعت،کرگل،۲۰۱۲ء،ص:ا

نعت:۔پیغمبر کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو نعت کہتے ہیں۔اس سلسلے میں صادق صاحب لکھتے ہیں:

''اسلامی نظریات کے مطابق اللہ تعالی کی حمد کے بعد نعت رسول مقبول کا درجہ آتا ہے۔بلتی ادب میں جس طرح دیگر اصناف سخن کی فراوانی ہے۔اسی طرح نعتیہ کلام کا دامن بھی کافی وسیع ہے۔بلتی شاعری میں کوئی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس کے مجموعہ کلام میں نعت شریف کا نسخہ موجود نہ ہو۔لیکن یہاں کے عام معاشرہ میں لوگ نعتیہ کلام کو بھی اصطلاحاً قصیدہ سے ہی منسوب کرتے ہیں بلتستان کے ان قدیم و جدید شعراء کے نعتیہ اشعار میں رسول اکرم کے اخلاق حسنہ، بندگی خداوندی، کرامات، معجزات، سخاوت اور غزوات کی واضح منظرکشی کی گئی ہے''۔ (بلتی ادب، ص:۲۷۰)

آدم ببہ پا سلسلہ یا رتھلفو محمد۔ عالم ناھر پدے جحتی کھار گیلفو محمد

کھوانگ رنمی دے لس بزوژہ خدا اژ الفو محمد اسلامی علم ھلژ نگسے کفر سنیلفو محمد۔۲ (بواعباس)

ترجمہ: خلقت کے دور تسلسل اور تقریب الہی میں سرور کائنات اپنے جدامجد حضرت آدمؑ سے بھی آگے نکل گئے۔توحید رب ایزدی کے دلائل اور براہین پیش کرنے میں سارے عالم پر آنخضرتؐ غالب رہے۔خداوند عالم نے بھی ہر معاملہ میں صرف آنخضرت ہی کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھا۔حضرت محمدؐ نے علم اسلام کو بلند کر کے کفر اور طاغوت کو نیچے گرادیا۔

اس شعر میں فارسی/اردو کے الفاظ آدم، سلسلہ، عالم، اسلام، علم وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

قصیدہ

قصیدہ ایک مقبول صنف شاعری رہی ہے۔قصیدہ کا لغوی معنی قصد کرنا ہوتا ہے۔اصطلاحاً وہ نظم جس میں کسی کی مدح یعنی تعریف کی جائے یا ہجو کی جائے۔اردو ادب میں قصیدہ فارسی سے لیا گیا ہے۔بلتی ادب میں بھی قصیدہ فارسی سے داخل ہوا ہے۔البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ اردو ادب میں قصیدے کا جو موضوع ہے وہ شخصی موضوع سے لیکر اجتماعی، درباری اور بادشاہوں کی مدح یا ہجو کرنے پر مبنی ہے۔لیکن بلتی ادب میں صنف قصیدہ صرف اور صرف حمد، نعت، اور اولیائے خدا تک محدود ہے۔

صادق ہرداسی لکھتے ہیں:

''قصائد اپنی ہیئت اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے فارسی سے ماخوذ ہیں اور فارسی شعراء نے اس کا سانچہ عربی سے لیا

۲۔صبا، راجہ محمد علی شاہ؛ مترجم، کلام بواعباس، شوق بجیس، جلد اول، سودے بکس لنک روڈ سکردو۔۲۰۰۹، ص:۲۱

ہے۔موضوع کے لحاظ سے قصیدے میں ممدوح کی تعریف ہوتی ہے۔خواہ یہ ممدوح کوئی امیر بادشاہ یا نامور شخصیت ہو یا مذہبی شخصیت لیکن خطء بلتستان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے باشندے صرف حمد باری تعالی اور رسول وآل رسول کے نعتیہ اور مدحیہ اشعار کو ہی قصیدہ کہتے ہیں۔بلتی ادب میں قصائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اور اس صنف میں ادب کا بہت بڑا مجموعہ بھی موجود ہے۔اگر چہ ان کا تحفظ وفروغ قوم کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔پھر بھی ہم ان صاحبان قلم وناشرین کے مرہون منت ہیں جنہوں نے ان بکھرے موتیوں کو جمع کر کے ''گلدستہ عباس''،''زبدۃ المناقب''اور''نفحات طیبہ'' کے نام سے منظر شہود پر لائے ہیں۔اگر چہ قصیدہ گوشعراء تو بہت گزرے ہیں لیکن سید عباس شاہ کو اس صنف شاعری میں ملک الشعراء کی حیثیت حاصل ہے''[1]

بلتی اصناف سخن میں قصیدہ نگاری ایک غیر معمولی صنف ہے،جس کی روایت کا سرا عربی اور فارسی زبان وادب سے ملتا ہے۔یہ بلتستان میں راجہ حسین علی خان محبؔ،راجہ حیدر خان حیدرؔ،راجہ حاتم خان حاتمؔ اور راجہ محمد علی خان ذاکرؔ سے ہوتی ہوئی سید عباس شاہؔ تک پہنچتی ہے۔بلتی ادب کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن قصیدہ نگاری کی ترقی بلتی شاعری کے اس دور میں ہوئی جب بوا عباس علیہ الرحمہ جیسے باشعور شاعر نے اس میں طبع آزمائی کی۔

بلتستان میں عام طور پر یہ بات مقبول عام ہے کہ بوا عباس مملکتِ قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو میں جو مرتبہ سوداؔ کا وہی مقام بلتی میں بوا عباس کا ہے۔البتہ ان کے موضوعات میں فرق ضرور ہے۔کیوں کہ بلتی زبان میں امراء،رؤساء اور بادشاہوں کے لئے قصائد نہیں لکھے جاتے۔یہاں مذہبی نوعیت کے قصائد کا رواج عام ہے۔

نونے یوت آیہ حدیث ینگنو دنیالدن کھوتی پھیا

مزدوری بینچہ بیاکھن نفس ناتھنو فاطمہ ان۔ا (بوا عباس)

ترجمہ: یہ تو آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی رو سے واضح ہے کہ دنیا و مافیہا انہیں کی خاطر خلق ہوئی ہے اس کے باوجود حضرت فاطمہ (س) ہستی ہیں جو نفس امارہ کے ساتھ ہمیشہ دست وگریباں رہ کر قوت لایموت کے لئے محنت مزدوری کرتی رہیں۔

اس شعر میں آیہ،حدیث،دنیا،مزدوری،نفس جیسے اردو/فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

---

(۱) بلتی ادب،ص:۲۷۰(۲)۔شوق نجیس،جلد اول،۲۰۰۹،ص:۴۳

مرثیہ ونوحہ

مرثیہ لفظ رثاء سے مشتق ہے جس کے معنی آہ و بکاء کے ہیں۔اس صنف میں شاعر مرنے والے کی صفات کو بیان کرتا ہے ۔جس کی وجہ سے سننے والے روتے ہیں یا غم کا اظہار کرتے ہیں۔اردو ادب میں یہ صنف فارسی سے آئی ہے۔اردو ادب میں اس صنف سخن میں شخصی مرثیے بھی کہے گئے ہیں۔لیکن اکثر واقعات کربلا سے متعلق مرثیے کہے گئے ہیں۔اب اس صنف سے مراد صرف اور صرف واقعہ کربلا کو بیان کرنا ہی مراد لیا جاتا ہے۔بلتی ادب میں صنف مرثیہ واقعہ کربلا سے ہی متعلق ہے۔

یہ انسانی فطرت میں داخل رہا ہے کہ جب کوئی عزیز جاں بحق ہوتا ہے تو اس کے لواحقین مختلف طریقے درد وغم کا اظہار کرتے ہیں۔اسی طرح مراثی کے ذریعے شاعر بھی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔اس صنف کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے ہابیل کی شہادت پر مرثیہ کہا جو سریانی زبان میں تھا۔اسی طرح اکثر بزرگوں نے اپنے عزیزوں کی موت پر مرثیہ خوانی کی ہے۔جیسا کہ مرزا غالب نے اپنے بھانجے عارف کی وفات پر اور علامہ اقبال نے اپنی والدہ کے انتقال پر اردو میں مرثیے کہے۔اردو، فارسی اور عربی کی طرح بلتی ادب میں بھی اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔اگر چہ مرثیے میں کسی مرنے والے کی یاد میں رنج وغم کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے ۔جس میں اس کی خوبیاں اور اوصاف گنوائے جاتے ہیں یا کسی مرنے والے کے ساتھ کئے گئے ظلم وستم کا بیان کیا جاتا ہے۔مرثیہ نگاری بلتی میں فارسی زبان سے آئی ہے۔فارسی ادب میں مرثیہ نگاری صرف واقعات کربلا کے بیان اور شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر شہدائے کربلا کے لئے مخصوص ہے۔بلتی ادب میں بھی اس کی یہی حیثیت ہے۔کیونکہ بلتیوں کی تقریباً نوے فیصد آبادی محبان چہاردہ معصومین پر مشتمل ہے۔اس لئے ایران اور لکھنؤ کی طرح یہاں بھی عزاداری ہوتی ہے۔محرم الحرام ،عشرہ اسد و دیگر عرسہائے چہاردہ معصومین کے موقعوں پر ماتمی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں جن میں مرثیہ خوانی ونوحہ سرائی کا رواج عام ہے۔نوحہ خوانی ،مرثیہ خوانی کی ایک ذیلی صنف ہے جس کے سوزِ طرز میں معمولی سا فرق ہے کیونکہ ان مجالس میں نوحہ کے سوز کے ساتھ سینہ زنی بھی کرتے ہیں۔صادق ہرداسی مرثیے کی تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۴۰ء میں بلتستان کے حکمرانوں اور باشندوں کے ہاتھوں سے عنانِ حکومت اور تلواریں چھین لی گئیں اور ہر قسم کے سیاسی مظالم ان پر ڈھائے گئے اور ساتھ ہی ظلم وستم پر گلہ،شکوہ یا احتجاج کرنا ناقابل معافی جرم قرار دے دیا گیا اور یہاں کے لوگوں کے جذبات وزبان پر سخت پابندی لگا دی گئی تو انہوں نے مرثیہ اہل بیت اطہار خصوصاً

شہداء کربلا اور اسیران کربلا اور اسیران شام کے سہارے پناہ ڈھونڈ لی۔اس طرح سقوط بلتستان کے بعد یہاں مرثیہ نگاری کو فروغ ملا۔ بلتستان کے آخری حکمران کے جلاوطن شہزادے حسین علی خان محبؔ اور محمد علی خان ذاکرؔ ممتاز شعراء گزرے ہیں۔ جنہوں نے بلتی فن مرثیہ گوئی کا حق ادا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بلتی معاشرہ میں ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد دوسروں کے کلام میں مزہ نہیں آتا بلتستان کی سرزمین نے شہزادہ حسین علی خان محبؔ اور شہزادہ محمد علی خان ذاکرؔ جیسے ممتاز مرثیہ گو شعراء جنم دیئے جن کے مراثی کو بلتستان، کرگل اور لیہہ لداخ میں وہی مقام حاصل ہے جو برصغیر میں انیسؔ و دبیرؔ اور ایران میں محتشم کو ہے۔‘‘۱

واقعات کربلا کے بیان میں بلتی مرثیہ نگاری نے جذبات نگاری کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ دیتے ہوئے بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں، پھران میں مختلف رتبے اور مختلف رشتوں کی نوعیت سے انسانی جذبات کی عکاسی کی ہے۔ چونکہ کربلا کا واقعہ ایک ایسا واقعہ تھا جہاں حق و باطل اور خیر وشر کا بھرپور معرکہ ہوا اور اس کے کردار اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل تھے جو حق کی سربلندی کے لئے اپنی جانیں قربان کر گئے۔میدان کارزار میں شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔اس لئے اسے بلاشبہ پاک قسم کی رزمیہ شاعری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا تھا۔لیکن بلتی مرثیوں میں ظلم وستم کی عکاسی، مظلومیت اور بے کسی کی روئیداد اور بین وبکا زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے انہیں رزمیہ شاعری نہیں کہا جاسکتا۔بلتی زبان کے مرثیے عام طور پر دو مصرعوں پر مشتمل سات بند سے بارہ بند کے درمیان ہوتے ہیں۔ان مرثیوں اور نوحوں کے نمونے مخزن البکا، منبع المصائب، غم کدہ، داستان کربلا اور ماتم کدہ کی بیاضوں میں چھپ چکے ہیں۔وہ لوگ قابل تعریف ہیں جنہوں نے ان مرثیوں اور نوحوں کو مجموعوں کی صورت میں کسی نہ کسی طرح شائع کر کے بدلتے زمانے کے ہاتھوں تلف ہونے سے بچالیا۔ (۱۔بلتی ادب: ص۲۷۲)

’’مرثیہ‘‘ لنچہ زیرس غو بین ایو چو یری حسین لا شا میو نی

بیاس دینے جسم بینگ می چھود پی ظلم کن سومید بیاسے (محبؔ)

بلتی مرثیہ کے اس شعر میں اردو، فارسی کے الفاظ، حسین، شام، ظلم استعمال ہوئے ہیں۔

’’نوحہ‘‘ چھوی فیلہ سکینہ نوین یودر بز گوے کا العطش زیرین عباسا

نی بیا چھوکھیونگمہ یودزیرے غدیا نگنہ گنگسے گنگسے ہلتین یود عباسا ۔(سید باقر حسینیؔ)

بحر طویل

بلتی ادب میں بحر طویل بھی فارسی ادب کی رہین منت ہے۔مسلسل خیالات کو بیان کرنے کے لئے اس صنف کا استعمال کیا جاتا ہے۔اردو ادب میں اکبرالہ آبادی نے اس صنف میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔بلتی ادب میں اس

صنف کا موجد جو ہرعلی جو ہر ہے۔انہوں نے اس صنف کو فارسی سے اخذ کیا ہے۔اس صنف کے بارے میں صادق صاحب لکھتے ہیں:۔

''بحر طویل ایک شاعری ہے جو بنیادی طور پر اہل ایران کی ایجاد ہے۔اوراس صنف نے بلتی ادب میں بھی بڑا اہم مقام حاصل کیا ہے۔دراصل یہ صنف سخن مسلسل خیالات وواقعات اور معاملات کے لئے موزوں ترین صنف ہے۔اس میں بحر کی کوئی قید نہیں، اشعار کی تعداد محدود یا مقرر نہیں ہے۔پوری نظم میں ایک بحر کی پابندی کے علاوہ ردیف اور قافیہ کی پابندی صرف ایک ایک شعری ہیئت میں ہے۔یعنی قصیدہ کی طرح شروع سے آخر تک ایک ہی ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔یہ بلتی شاعری کی ایک منفرد اور دلچسپ صنف ہے۔اس کے اشعار لمبی بحر میں ہوتے ہیں۔ہر بند الگ اوزان اور الگ قافیوں میں بھی ہوتا ہے۔اور بیس پچیس مصرعوں پر مشتمل ایک بند مکمل ہوجاتا ہے۔یہ مصرعے کلی طور پر یا جزوی طور پر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔آخر میں را، یا، کر، یا لفظ بطور ردیف لایا جاتا ہے۔اس صنف کا مخصوص موضوع رزمیہ ہے۔جس میں حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول اور چہاردہ معصومین کی منقبت پر مبنی تمہید، گریز، دعا اور خاتمہ یعنی چار حصے ہوتے ہیں۔بعض بحر طویل ایسے بھی ہیں جن کے قصے کہانیاں اور واقعے فارسی سے ماخوذ ہیں مگر ان پر بلتی شعراء نے علاقائی تہذیبی رنگ دے کر طبع آزمائی کی ہے۔بحر طویل کو بلتی ادب میں کئی پہلو سے اہمیت حاصل ہے۔جو شعری دنیا میں بلند درجہ رکھتی ہے۔موضوع کی بلندی، اسلوب کی سنجیدگی اور فصاحت بلاغت کے اعتبار سے نقاد ہمیشہ اس سے مرعوب رہے ہیں۔بحر طویل کا اسلوب اور طرز ادا نہایت بلیغ وسنجیدہ اور واقعات کی رفتار نہایت تیز اور چست ہوتی ہے۔بلتی قوم کو اس صنف شاعری پر بجا طور پر فخر ہے۔بحر طویل عید کی محفلوں میں مخصوص لے اور انداز میں پڑھی جاتی ہے۔اس میں اسلامی جنگوں کی منظر کشی، رسول اکرم اور حضرت علی کے معجزات، تاریخی واقعات اور شخصیات کے علاوہ عارفانہ اور دنیا کی بے ثباتی کے شکوے نہایت شستہ اور ڈرامائی انداز میں پائے جاتے ہیں''۔

(بلتی ادب، ص:۲۷۳)

کھونی ستو دکھونی محیطی تھنے لاخلن لہ بورے ھلچو نری ستر انگسے
ختمی دے شقبونی دے ساقیووی کھنہ (جام) چی لینے نفس زری کھا
سنینی جام پو ینگ کھرے سکا نگسے
تمی تازی ھرتو لہ تو نگ تھیا قپی تھگی کھاھرتہ بریسنگ کھڈ پا بیا سے چوپ چادے خسا نگسے۔

مثنوی

اصناف شاعری میں مثنوی ایک قدیم صنف سخن ہے۔مثنوی لغت کی اعتبار سے نظم کی ایک قسم ہے جس میں

واقعات کا تسلسل پایا جاتا ہے۔اس میں ہر شعر کا قافیہ جدا لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔اور اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔اصطلاحاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیئت کے اعتبار سے ایسی مسلسل صنف سخن اور نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے لیکن ساری مثنوی ایک ہی بحر میں ہو۔مثنوی میں عموماً لمبے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔بلتی ادب میں مثنوی کے لئے مذہبی نوعیت کے موضوعات مختص ہیں۔صادق صاحب لکھتے ہیں:۔

''یہ صنف اگر چہ فارسی اور اردو ادب میں عام طور پر رزمیہ شاعری کے لئے مختص ہے لیکن بلتی ادب میں ولادتِ چہاردہ معصومین اور ان کے معجزات بیان کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے، کیوں کہ رزمیہ شاعری کے لئے بلتی ادب میں الگ صنف سخن ''بحر طویل'' مخصوص ہے۔جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔بلتی ادب میں ولادت و معجزات چہاردہ معصومین اور پند و نصائح کے موضوعات پر درجنوں مثنویاں موجود ہیں لیکن یہاں کے، معاشرے میں یہ شاعری ''گوشوارہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے، جس کی اصل صنف مثنوی ہے۔یہ ایک مسلسل نظم ہوتی ہے اس کے ہر شعر کا قافیہ جدا لیکن ہم وزن ہوتا ہے۔مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالب مربوط ہوتے ہیں۔گوشوارہ فارسی زبان میں خواتین کے ایک زیور کان کی بالیوں کو کہتے ہیں۔کیونکہ یہ بالیاں برابر ہوتی ہیں اور کانوں میں برابر لٹکتی ہیں اور تعداد میں بھی دو ہوتی ہیں چونکہ مثنوی دو دو ہم قافیہ اور ہم ردیف اشعار پر مشتمل ہوتی ہے، لہذا قیاس یہی ہے کہ اس وجہ سے بلتی میں مثنوی کو گوشوارہ کہا جانے لگا،،۔(بلتی ادب:۲۷۵)

بطور مثال

شکور ستونگ خالق جن و بشر لا
شکر ستونگ مالک مہر وقمر لا
خسما سینگ زیر بہ ہلچیو تھونگما لامکپو
کھوے شز دیونگ ہلتوسی عجب یود چگنہ چکپو (فدا حسین ثمیم)

غزل

غزل شاعری کی ہر دل عزیز اور مقبول ترین صنف ہے، جس میں حسن و عشق کا ذکر ہوتا ہے۔اس میں عشق و عاشقی کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں چاہے وہ عشق، عشق حقیقی ہو یا مجازی۔غزل کا ہر شعر ایک مکمل مضمون ہوتا ہے۔اس کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے یہ صنف بھی دوسری اصناف کی طرح فارسی سے بلتی میں داخل ہوئی ہے۔بلتی میں اسے 'خلو' کہتے ہیں۔

صادق صاحب لکھتے ہیں:۔

''بلتی شاعری کی اصناف میں ایک صنف غزل بھی ہے، جسے یہاں کے قدیم ادب میں ''خلو'' کہتے ہیں۔لیکن آج کل یہ ''خلو'' غزل کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔شروع شروع میں غزل عشقیہ جذبات و خیالات ظاہر کرنے کے لئے ایجاد کی گئی۔ اس لئے غزل کے معنی بتائے جاتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے بارے میں گفت و شنید کرنا۔ممکن ہے یہ دونوں مفاہیم صحیح ہوں۔بلتی ادب کے ابتدائی دور میں عاشقانہ مضامین عام طور پر پیش کئے گئے ہیں جن میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں ملتے ہیں۔آج کل کے جدید دور میں بلتی شعراء نے غزلیات میں عاشقانہ مضامین کے علاوہ سیاسیات ، اقتصادیات، مذہبیات، فلسفہ، اخلاقیات اور وعظ و نصیحت کے مضامین بھی باندھنا شروع کئے ہیں۔بلتی ادب میں جس طرح دوسری اصناف سخن کی فراوانی ہے۔اسی طرح غزل کے میدان میں بھی یہ صنف کسی سے پیچھے نہیں۔'' (بلتی ادب، ص:۲۷۵)

بلتی زبان و ادب کے قدیم غزل گو شعراء میں شہزادہ حسین علی خان محبؔ سکردو (مقپون)، کاچو اسفندیار خان خپلو (یبگو) اور مراد علی خان مرادؔ شگر (اماچہ) کے نام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے بلتی غزل کو نیا افق عطا کیا۔ان معروف شعراء کی غزلیں فکر و فن کے لحاظ سے اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سی ایسی معیاری غزلیں بھی ملتی ہیں جن کے تخلیق کاروں کا نام پردۂ خفا میں ہے۔تاہم شمیم بلتستانیؔ، محمد علی خان واحدؔ، غلام مہدی مرغوبؔ، غلام حسن حسنیؔ اور صادق علی صادقؔ قابل ذکر نام ہیں۔

بیا سے فیوخ فیوخ نہ جلتہ نہ <u>ہدایت</u>

یری <u>عاشق</u> چی ہلنگ سینگ نو سکارے <u>یودا</u>[1]

اس شعر میں اردو کے الفاظ ہدایت اور عاشق استعمال ہوئے ہیں۔

شہر آشوب

شہر آشوب سے مراد وہ نظم جس میں کسی شہر کی پریشاں حالی اور بربادی کا ذکر کیا جاتا ہے۔اس کے لئے کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے بلکہ کسی بھی ہیئت میں اسے لکھا جا سکتا ہے۔بقول صادق ہرداسی:

''شہر آشوب کی اصطلاح اردو اصناف سخن کے سلسلے میں دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔پہلا یہ کہ اس میں مختلف پیشہ ور حسینوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی ہے۔جب کہ دوسرا مفہوم شہر آشوب کا اس سے قطعاً مختلف ہے۔اس سے مراد ایسی

۱۔صادقؔ، علی صادق (صدائے صادق (جلد دوم تا چہارم) خسمی بیا بیونگ، مجموعہ کلام۔ بزبان بلتی۔ایس ایس انٹرپرائزز، دریا گنج دہلی، ۲۰۰۴، ص:۲۷

تمام نظمیں ہیں جن میں کسی شہر کی پریشانی و بربادی، اخلاق اقدار کی پامالی، سیاسی اور تہذیبی انقلاب، اپنے عہد کے انتشار اور بحران کی ترجمانی کی گئی ہو"۔ (بلتی ادب،ص:۲۷۶)

بلتی ادب میں اس صنف سخن پر زیادہ توجہ صَرف نہیں کی گئی۔یہی سبب ہے کہ اس میں زیادہ نمونے اس طرح نہیں ملتے جس طرح دوسری اصناف کے نمونے دستیاب ہیں۔البتہ عمومی طور پر قصائد، رزمیہ اشعار، غزلیں اور مذمت دنیا کی نظموں میں کہیں کہیں شہرآشوب کے نقوش ملتے ہیں۔مثلاً شہزادہ حسین علی خان محبؔ کا کلام جسے کچھ لوگ غزل میں شمار کرتے ہیں تو کچھ لوگ اسے دیوان کے نام سے گردانتے ہیں۔دراصل یہ کلام شہرآشوب ہے۔کیونکہ ۱۸۴۰ء میں سقوط بلتستان کے بعد اس علاقے پر یاس و ناامیدی اور بے اعتدالی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔خوشی اور مسرت ناپید ہو چکی تھی۔ آزادی کی دولت کھو کر یہاں کی عوام غلامی اور اسیری سے دوچار تھی۔اجتماعی خلوص مفقود ہو کر نفسانفسی کا عالم تھا۔ایسے وقت میں محبؔ ایک طرف جہاں دنیا کی مذمت کرتے ہیں تو وہیں دوسری جانب حسن و جمال کی تعریف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔محبؔ کے یہاں بیک وقت لاشعور کی دو لہریں کام کر رہی ہیں۔ایک لہر ہے جسے سب کچھ ختم ہونے کا یقین ہے۔ان کے سامنے زبوں حالی، پسپائی، شکست خوردگی اور برہنگی کا روح فرسا تخیل خیرہ کن سچائیوں کے ساتھ روشن ہے۔انھوں نے ان خیالات کو جمالیات حزن کے ساتھ پیش کیا ہے جسے شہرآشوب کی عمدہ مثال قرار دیا جاتا ہے۔

عالم پو لا نو نسید پا کھا ئک حسن جما لینگ
سے غد ونگپو د یکھ یو د یا صورا تینگ نوکھوتی زینگ
مک کنی کھڑ ہ چھینو نیکھ مک سنینگ کئی بید لینگ
مک شوق کنی شوق کنی شوقز گونگ فیسے ہلتے من ناکھیر بدسنینگ

عالم، حسن و جمال، صورت اردو کے الفاظ ہیں جو اس شعر میں استعمال ہوئے ہیں۔

منظوم تراجم

عام طور پر شاعری میں پیچیدگی اور ابہام پایا جاتا ہے اس کے بالمقابل نثر آسان اور سادگی سے عبارت ہوتی ہے۔ لیکن شاعری میں جو حسن، آہنگ اور نغمگیت ہے وہ نثر میں نہیں ہے۔اسی بنا پر بعض نثر کے منظوم تراجم کئے جاتے ہیں جن کی اپنی الگ شناخت ہوتی ہے۔

بقول صادق ہرداسیؔ:۔

"علمی و ادبی نگارشات کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منظوم ترجمہ کیا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔البتہ یہ ایک دشوار

فن سمجھا جاتا ہے۔اس وجہ سے بڑے بڑے مترجم اس کام سے خوفزدہ رہے ہیں۔اس خوف کے کئی پہلو ہیں۔خوف اور وسوسے کی ہزار باتیں سننے میں آتی ہیں۔مثلاً یہ کہ مترجم کے لئے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔جو اس کتاب اور فن پارے کے مصنف کا ہو جس کا ترجمہ کرنا مقصود ود ہو۔مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کا ماہر ہو۔ایک وہ زبان جس سے ترجمہ کرنا ہے اور دوسری وہ جس میں ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ایسی بہت سی باتیں مترجم کے لیے دشواری کا باعث بنتی ہیں''۔ (بلتی ادب'ایک مختصر تاریخ'ص:۲۷۸)

کسی بھی فن پارے کا منظوم ترجمہ آسان کام نہیں۔اس کے لئے شاعرانہ مزاج اور زبان پر مکمل دسترس درکار ہوتی ہے۔بلتی زبان کے کچھ شاعروں نے اس کام کو بہ حسن خوبی انجام دیا ہے۔انھوں نے بہت سے فارسی اور اردو کلام کا بلتی میں منظوم تراجم کئے۔بلتی میں نثری ترجمے پہلے سے ہوتے رہے ہیں جن میں متی کی انجیل اور قرآن کا ترجمہ قابل ذکر ہے اور گزشتہ کئی سالوں میں عربی سے ''صحیفہ مہدیہ''،''صحیفہ سجادیہ'' اور ''دعا کمیل'' کا بھی بلتی زبان میں نثری ترجمہ ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔لیکن شاعروں میں منظوم ترجمہ کا باقاعدہ سلسلہ آخون محمد سلطان سندوس نے فارسی کتاب ''بعد حمد'' کا بلتی میں منظوم ترجمہ کر کے شروع کیا جسے ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند شیخ علی نجفی نے شائع کیا۔ان کے علاوہ راجہ محمد علی شاہ صباؔ، فدا حسین شمیمؔ، غلام حسن حسنیؔ، حشمت علی کمال الہامیؔ اور غلام محمد بسملؔ وغیرہ شعراء نے علامہ اقبال اور مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بہت سے اردو اور فارسی کلام کا بلتی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔بالخصوص شمیمؔ بلتستانی نے اردو اور فارسی کلام کے بلتی میں منظوم تراجم کر کے اس ضمن میں قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ان منظوم تراجم سے بلتی زبان وادب کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔

زرعی نغمہ

لداخ و بلتستان کا علاقہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں پہلے زمانے میں ذریعۂ معاش کے لئے لوگ صرف اور صرف کھیتی باڑی پر ہی منحصر تھے۔کاشتکاروں کی ہمت اور حوصلہ افزائی کے لئے جو صنف وجود میں آئی اسے زرعی نغمہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔صادق صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''لداخ اور بلتستان کی تقریباً ننانوے فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے۔اگر چہ یہاں کے محدود ذرائع کاشتکاری کے لحاظ سے مناسب نہیں ہیں تاہم کسان حد درجہ محنت ومشقت کرتے ہیں۔یہاں کے شعراء نے اپنے محنت کش کسان بھائیوں کی ہمت افزائی کے لئے ایک نئی صنف سخن ''زرعی نغمہ یا گیت'' کو اپنایا ہے،جن میں کسان اور مزدور کے ساتھ ہمدردی کے جذبات جھلکتے ہیں۔زرعی نغمہ لکھنے والے شاعروں میں شمیمؔ بلتستانی، غلام محمد بسملؔ، وزیر احمد رونگ یل، غلام حسن حسنیؔ اور حاجی غلام حسن

طالبؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں‘‘۔(بلتی دب،صفحہ:۲۷۹)

سبق چوق سکیورے نور بنگ ژلبہ بب گوید

گاہے سونگنہ ری چھو ہرکون فیانمہ ستب گوید (بشارتؔ)۱

اس شعر میں سبق، گاہے، جیسے اردو/فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(۱۔بشارتؔ، آخوند اصغر علی؛ بزم بشارت (کلیات)، بشارت پبلشرز کرکیت چھو، کرگل۔۲۰۱۱ء)

موسیقی

موسیقی فنون لطیفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔بلتستان اورلداخ میں اس کی روایت بہت پرانی ہے۔اسے ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

بلتستان کی قدیم لوک داستانوں، قصوں اور کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شروع میں تبّتی الاصل مذہب ’’بون مت‘‘ کے زمانے میں رقص وموسیقی کا چلن بہت زیادہ تھا۔جیسا کہ داستانِ کیسر میں رسمِ سوئمبر کے ضمن میں رقص و موسیقی کا تذکرہ خوب ملتا ہے، بلکہ اس مذہب کی باقیات میں سے یہ عقیدہ کچھ عرصہ قبل تک لوگوں کے ذہن میں تھا کہ ہمارا علاقہ دیوتاؤں یعنی ’’ہلا اور ہلامو‘‘ کی سرزمین ہے اور ان دیوتاؤں کی خوشامد کے لیے موسیقی کا رواج ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔شروع میں لوک داستانوں یعنی ہلافو کیسر، رگیالوستر البو، اور رگیالو چولو بزانگ وغیرہ کے منظوم حصوں کی دھنیں رائج ہوگئیں اور جستہ جستہ لوک گیتوں کی دھنیں بھی وضع ہوتی گئیں۔جب بلتستان میں دیگر علاقوں سے مختلف اقوام آکر آباد ہونے لگیں تو وہ لوگ اپنے ساتھ اپنے مذہب اور عقائد کی دھنیں بھی ساتھ لائے جنھیں ’’چھوس‘‘ کہا جاتا ہے۔عوامی میلوں میں وہ انہی دھنوں پر رقص کیا جاتا تھا۔چھوس کی کئی قسمیں ہیں۔بلتی چھوس، کھچے (کشمیری) چھوس، بروق (درد) چھوس، مون چھوس، بودھ چھوس، بان چھوس موسیقی اشاعت اسلام کے بعد موسیقی کی صورت حال پر **صادق صاحب لکھتے ہیں کہ**، چودھویں صدی عیسوی کے دوران جب اسلامی تبلیغ کے لئے ایرانی مبلغین کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں کی تہذیب وتمدن اور فنون لطیفہ بھی ایرانی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ دور سے قبل ہی ایرانی فنونِ لطیفہ اور موسیقی بلتستان میں رائج ہو چکی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ ایرانی موسیقی کے اصولوں میں موجود مقامات، اوزل یا غزل، گوشہ اور روانی وغیرہ بلتستان میں آج بھی مروجہ ہے۔

جب مقپون علی شیر خان انچنؔ بلتستان کا الوالعزم حکمران بنا تو مغل دربار کے ساتھ اس کے روابط پیدا ہوئے۔اس کی بیٹی کی شادی شہنشاہ جہانگیر سے ہوئی جبکہ ایک مقامی روایت کے مطابق خود علی شیر خان انچنؔ نے بھی ایک مغل

شہزادی گل خاتوں سے شادی کی تھی۔ان سیاسی اثر ورسوخ کے حوالے سے علی شیر خان انچن نے بلتستان کے نقارچیوں کا ایک ٹولہ دہلی بھیجا تھا کہ وہ مغلیہ دربار سے وابستہ موسیقاروں سے حربی وکلاسیکی ساز سیکھ کے آئے۔اسی دور میں مغلیہ دربار کے طرز پر بلتستان کے راجاؤں کے محلات میں بھی نوبت خانے بنائے گئے جہاں روزانہ وقت پر نوبت بجائی جاتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مقپون راجہ آدم خان بھی مغلیہ دربار سے وابستہ رہا جس نے اپنے قیام دہلی اور آگرہ کے دوران مغل درباری موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور بلتستان آکر انہیں رائج کیا۔یبگو محمد علی خان نے جموں میں اپنی نظر بندی کے دوران ہندی موسیقی اور مغلیہ درباری موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ بتایا جاتا ہے کہ شہنائی اور نئے بجانے میں بڑے مشاق استاد تھے۔آپ نے واپس آکر بلتستان کی وادی خپلو میں بہت سے سازندوں کو اپنی اپنی ریاست کے مختلف پرگنوں میں زمینیں دے کر آباد کرایا۔وقتاً فوقتاً ان سازندوں کو جمع کر کے ان کا امتحان لیا جاتا تھا اور کامیاب سازندوں کو انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔

خپلو کے یبگو راجہ حاتم خان ثانی فارسی شاعری کے علاوہ موسیقی سے خاص شغف رکھتے تھے۔آپ مولانا عمر سمر قندی المعروف ملا محمد حسین پشاوری کے شاگرد تھے اور موسیقی کا فن انہیں سے سیکھا تھا۔

دینی مبلغین میں سے جس شخص نے بلتستان میں فن موسیقی کو فروغ دیا ان میں مولانا محمد عمر سمر قندی المعروف ملا محمد حسین پشاوری کا نام قابل ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ سمرقند کے رہنے والے اور جامعہ عرب کے فارغ التحصیل تھے۔ بغرض تبلیغ دین چینی ترکستان سے ہوتے ہوئے لداخ اور آخر براستہ چھور بٹ لا بلتستان میں وارد ہوئے۔ملا پشاوری کو علم موسیقی میں کامل دسترس حاصل تھی۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بلتستان کے باذوق افراد کو دیگر علوم کے علاوہ موسیقی کا فن بھی سکھایا۔

مورخین کے مطابق لداخ کا راجہ جمیا نگ نمگیل کی شادی رگیل خاتون سے طے پانے کے بعد بلتستان سے چند موسیقاروں کو لداخ بھیجا گیا۔صادق صاحب کے بقول ان کی اولاد آج بھی اسی پیشہ سے منسلک ہے۔استاد محمد علی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

خپلو کے حکمران راجہ اسفندیار خان بھی فنِ موسیقی کے ماہر مانے جاتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے راگ ''سارنگ'' اور ''تلنگ'' میں تحریفات کر کے ''ساز ہندی'' نامی ایک مقام ایجاد کیا جو آج تک قائم ہے۔

خپلو ہلدی کا سنگ سنگ بلتستان کا وہ آخری موسیقار تھا جو ساٹھ حریب بجا سکتا تھا جس کا انتقال ۱۹۸۲ء میں ہوا۔

بلتستان میں کلاسیکی، جنگی، غنائیہ اور دعائیہ سازوں کی کل تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے۔ اور موجودہ موسیقاران میں سے چند دھنیں بجا سکتے ہیں۔ آج کل بلتستان میں قدیم موسیقی کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے اور بہت سے لوگوں کے نام بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ رقص و موسیقی کے ماہر اور فنکار بھی اب ناپید ہیں۔

بلتستان میں اشاعت اسلام کے بعد جو موسیقی متعارف و مروج ہوئی یہاں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جن کی دو بڑی قسمیں حریب اور ہرژے کار ہیں۔

حریب:۔ یہ عربی لفظ حرب سے مشتق ہے اور رگیا لفو علی شیر خان انچن کے دور میں سازوں کے ساتھ یہ نامہ بلتستان میں پہنچا۔ اس کی کل پچاس قسمیں تھیں جن میں سے درج ذیل کے نام دستیاب ہیں اور انھیں بہت کم موسیقار بجا سکتے ہیں۔

۱۔یگاہ ۲۔دوگاہ ۳۔سہ گاہ ۴۔ چہارگاہ ۵۔ پنج گاہ ۶۔نوبت ۷۔مغلوب ۸۔شادیان ۹۔نجم ۱۰۔بایت ۱۱۔فرود ۱۲۔دلاور ۱۳۔پشتنی عنبر ۱۴۔ہزار داستان ۱۵۔سحر آگاہ ۱۶۔مجاز ۱۷۔عشاق ۱۸۔صبح صادق ۱۹۔چمن بے نظیر ۲۰۔ساز ہندی ۲۱۔دبرات ۲۲۔دور ساقی ۲۳۔سیندوری ۲۴۔اوزل ۲۵۔ذکر ۲۶۔حسینی ۲۷۔غم ۲۸۔بم ۲۹۔مخالف ۳۰۔ برہ ڈم ۳۱۔چھوغوسیگہ ۳۲۔ژھوگنہ سیگہ ۳۳۔ بوتی سیگہ ۳۴۔سترقپہ رگو فچوس ۳۵۔میون ژھانگ چھیس۔

صادق صاحب کے بقول:

''نقی محمد خورجوی کی کتاب'' حیات خسروی'' کے مطابق ''شایان سے لے کے ''جنجوق'' تک میں سے اکثر راگ ہندوستان میں مروج تھے اور متعدد راگوں کو امیر خسرو کی بتایا جاتا ہے۔ بلتستان میں رائج ان سبھی راگوں کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص فارسی موسیقی سے مستعار ہیں۔ اگر چہ ان راگوں کے پس منظر کے بارے میں اس وقت لوگوں کے پاس خاص معلومات نہیں ہیں تاہم فن کاروں کا کہنا ہے کہ ان تمام سازوں کے پس منظر میں معانی و مقاصد ہیں اور یہ مخصوص موقعوں پر بجائے جاتے ہیں۔ شادان اور بم حریب کی حیثیت جنگی سگنل کی ہے جب کہ ذکر ایک دعائیہ حریب بتائی جاتی ہے''۔[۱]

۲۔لمنہ: اس کی بارہ قسمیں تھیں جن میں سے چند دھنیں مخصوص ہیں۔ یہ انھیں لشکر یا پولو ٹیم کے چلنے کے دوران بجایا جاتا ہے:

۱۔چھوغولمنہ ۲۔رگیالم چھنمو ۳۔بودھی لمنہ ۴۔مقپون ستن لہ شخفہ۔

۱۔ ہرداسی، محمد صادق؛ بلتی ادب، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۷ء، ص: ۹۷

۳۔ ہرسیکار: ناچ کی دھنوں کو ہرسیکار (ہرژیکار) کہتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ا۔ چھوغو پراسول: کلاسیکی دھن ہے اور یہ بارہ مختلف دھنوں کا مجموعہ ہے اور گیالفو علی شیر خان انچن کی فتح چترال کی یادگار ہے۔ چونکہ اس دھن پر رگیالفو کے شہزادے ناچتے تھے۔ اس لئے ان کی یاد میں اب بھی یہ ساز بجاتے وقت بڑے ڈھول (ڈیانگ) والا اسے کھڑے ہوکر بجاتا ہے اس میں کئی افراد تلوار کے ساتھ ناچتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے دھن گاشوپا، سنیوپا، تھین کار، بوراکار، لنگ کار، میندوق کار، نایوکار، فوتونگ کار، فورگونی کار، چلاہو وغیرہ ہیں۔

فورگونی کار: یہ بھی کلاسیکی ہے اور دو مرحلوں پر مشتمل ہے اس دھن کے ساتھ ناچنے والے ہاتھوں میں چادر لیے کبوتر کی اڑان کے انداز پر رقص کرتے ہیں۔ یہ ''پھوگون کار'' یعنی کبوتر رقص بھی کہلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھن چپلو کے علاقہ بلاغر میں تخلیق ہوئی ہو۔ جیسا کہ اس دھن میں ایک بول ہے جس سے جس میں بلاغر گاؤں کا ذکر ہے۔

متن:۔ بلاغر یول سکل لانس بزنگ سمنید خیوفورگون لے
نس بزنگ پوزوسے ناجینگ ہرژیس چی تونگ خیوفورگون
جینگ ہرژیس مہ تنگنہ جینگمہ چق توک خیوفورگون لے

ترجمہ:۔
اے نیلے کبوتر! بلاغر بستی کے مرکز میں جو کی فصل پک گئی ہے
اے نیلے کبوتر! جو کا دانہ کھا کر گردن ناچ شروع کر
اے نیلے کبوتر! گردن نہ نچانے کی صورت میں گردن توڑ دوں گا۔

بلتی کلاسیکی شاعری میں زیادہ تر اپنی زبان کے الفاظ کو ہی ہی فوقیت دی گئی ہے۔ ان میں اردو یا فارسی کے الفاظ بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اوپر والے شعر میں نہ ہی فارسی کے الفاظ موجود ہیں اور نہ اردو کے، صرف رسم الخط اردو کا ہے۔

ستغرا: پولو کھیل میں جب کوئی ٹیم گول کرتی ہے تو اس کا کوئی کھلاڑی گیند کو ہاتھ میں لئے مخالف سمت گھوڑا دوڑاتا ہے اور گراؤنڈ کے درمیان میں پہنچ کر گیند کو ہوا میں اچھال کر مارتا ہے اسے ''ڈافوق'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر خاص دھنیں کھلاڑی کے رتبے کے مطابق بجائی جاتی۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔

ا۔ تاجور: یہ دھن صرف رگیالفو، راجہ اور ولی عہد کے لئے بجائی جاتی ہے۔
۲۔ بختاور: یہ دھن حکمران خانداں کے افراد کے لئے بجائی جاتی ہے۔
۳۔ بخشاور: یہ دھن وزیروں اور اعلی عہدیداروں کے لئے بجائی جاتی ہے۔

۴۔گلاور: یہ دھن عام طبقہ کے کھلاڑیوں کے لئے بجائی جاتی ہے۔

ان کے متعلق روایت یہ ہے کہ یہ ساری دھنیں رگیالفوعلی شیر خان انچن کے دور میں ہندوستان (مغلیہ نقارچیوں) سے بلتستان پہونچیں۔

بحرکیف فن موسیقی خود کی ایک الگ دنیا ہے۔ جسے ایک اس مقالے میں کلی طور پر سمیٹنا مشکل ہے۔اس کے لئے الگ مقالہ یا کتاب درکار ہے جس میں اس کے حوالے سے مکمل بحث ہوسکتی ہے۔

بلتی لوک گیت

لوک بمعنی بشر،عوام، انسان اور گیت سے مراد راگ، بھجن، سرور ہے۔اگر ہم لوک گیت کو سمجھنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں یہ کسی خاص علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں اس علاقہ کے لوگوں کی ترجیحات منعکس ہوتی ہے یہ وہ اثاثہ ہے جو نسل درنسل منتقل ہوتا ہے۔بلتستان یا لداخ میں بلتی لوک گیتوں کا ذخیرہ تحریری شکل میں موجود نہیں تھا لیکن بعد میں ادیبوں نے اسے تحریر کیا۔

محمد عباس کھرگرونگ لکھتے ہیں۔

''مغربی تبت کی تہذیب کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس ایک ہی حربہ موجود ہے۔وہ یہاں کی لوک ثقافت ہے جس نے سینہ بہ سینہ سفر کیا ہے۔ورنہ ہمارے پاس تاریخی مواد یا دستاویز دستیاب نہیں۔لوک کہانیوں اور گیتوں میں قدیم عہد کے ہمارے بزرگوں کے خیالات، رہن سہن اور معاشرت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے اور ایک حقیقت بالکل کھل کر سامنے آتی ہے۔یعنی اس عہد کے انسانوں میں ریاکاری اور منافقت نامی کوئی شے موجود نہیں تھی۔گو خیر اور شر دونوں انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔مکر و فریب کے جال بنتے ضرور ہونگے لیکن عمومی طور پر اس روش کی حوصلہ شکنی رہی ہے''۔۱

قدیم گیت کا رجن کی کل تخلیقی کائنات صرف ایک گیت پر ہی مبنی ہوتی ہے اور وہ خود اس گیت کا مرکزی کردار بھی ہوتا ہے۔جو کچھ خود پر بیت چکا ہوتا ہے، وہی کچھ کہا ہوا ہوتا ہے۔ان گیتوں میں بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ موسیقی کی ہلکی چاشنی بھی رچی ہوتی ہے۔آج ان گیتوں اور ہمارے درمیان وقت کا طویل فاصلہ حائل ہو چکا ہے۔

فارسی اور اردو ادب کے زیر اثر نئی نئی اصطلاحات اور ابتدائی ذہنی سطح کے مضامین لکھے جاتے ہیں۔لیکن جن کو ذرا سی بھی ان گیتوں سے واقفیت ہے۔ یہ گیت دل کے نازک تاروں میں جو ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں، وہ آج کی تخلیقات میں کہاں۔جہاں مخصوص سچائی کو تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قدیم گیتوں کے سمجھنے والے اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جب بھی انسان کو کسی درد وغم سے پالا پڑا تو وہ فطرت کے

انہی ساتھیوں کو مخاطب کر کے دل کی باتیں سناتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ تہذیبی نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟

خمو لبے کلون! یا نگ شخسید زیرے ژلا کو سنہ لے

بوژو خسیری تباق لانا ہے لے

خسیری فیا ختب کھورے ژاغونی ژو

یا نگ لاکھیو نگنوگ لے

ژلا ستروق یری شا۔نا ہے لے

شاہ رگیل سہ چھوغوے۔

خمو لبے مہ خسام نا بوژو دو گیی مین ہے لے

ترجمہ: اگر میں سنوں کہ خمو لبے کالون آپ تشریف لا رہے ہیں

تو یہ لڑکی سنہرے پلیٹ میں سونے کا تحفہ سجائے

آپ کا استقبال کرے گی

آپ ایک بڑے علاقے کے سردار ہیں

لیکن میں آپ کے بارے میں بن سوچے کیسے رہ سکتی ہوں

اس گیت میں اردو/ فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہے سارا گیت بلتی زبان میں ہی ہے البتہ رسم الخط فارسی یا اردو کا ہے۔

اس گیت کے بارے وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

اس گیت میں برس ہا برس کی ماری ایک لڑکی اپنے محبوب کے انتظار کی کیفیت سے دوچار ہے۔ لیکن کلون کا رتبہ عام آدمیوں سے بھی بڑا ہے۔ اس لئے سونے چاندی کا تذکرہ کر کے اس کے رتبہ اور شان کو عیاں کیا ہے۔ لیکن اپنی بے بسی صرف ایک مختصر سی بات میں ظاہر کی ہے کہ آپ کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سوچ پر میرا اختیار نہیں ہے۔ گیت کے بول ہمیں سونے چاندی کی جھنکاروں میں سنائی دیتے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سناٹا اور خاموشی کا سماں بھی ابھر آیا ہے جس نے انتظار کی کیفیت سے دوچار دل کو اپنی آماج گاہ بنا رکھا ہے۔ (۱، نگارشات بلتستان، ص۔۱۳۶۔)

۱۔ ژھونژے ملبیک، ۲ ملبیکی شاریدخ اور دوسرے گیت بھی بلتی زبان میں ملتے ہیں۔

قدیم بلتی شاعری کو ''رگیا خلو'' کہتے ہیں۔ دراصل یہ کلاسیکی لوک گیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صنف سخن نظم معریٰ کی طرح قافیے کی پابندی سے آزاد ہے اور اس کو آج تک قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔ ان گیتوں میں کوئی نہ کوئی

عشقیہ، رزمیہ یا ناصحانہ پس منظر ہوتا ہے۔ان میں ہجر کی داستان ، بے وفائی کے واقعات، وصل کا انتظار، والدین کی نصیحتیں اور تاریخی واقعات کا بیان کئے جاتے ہیں۔

گذشتہ عہد میں بلتستان لوگ ان گیتوں سے پیام رسانی کا کام لیتے تھے اور علاقے کے عمر رسیدہ لوگ اس قسم کی پیام رسانی سے اب بھی واقف ہیں۔لوک گیت کے پس منظر اور اس سے وابستہ واقعات کی سمجھ سے بہ آسانی پیغام بھیجنے والے کے مافی الضمیر کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں اگر بے وفائی کی شکایت مقصود ہو تو 'شینگ کھن کوفہ پی خلو' بطور تحفہ بھیجا جاتا ہے۔''شینگ کھن کوفہ''یعنی کوئی بڑھئی کا نام سن کر ہی لوگوں کا ذہن فوراً اس مشہور واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔جو اس لوک گیت سے وابستہ ہے۔

بحر کیف ہم بلتی لوک گیت کے چند اہم مصرعے یہاں بطور مثال پیش کرتے ہیں:۔

۱۔دینے چنیے نمزے سونگ ظلم شخمید کن تھونید لے چو امیر حیدر
یاری بلانا چھوقفہ یودنا ناغونی آنو سکوری لے چو امیر حیدر

۲۔یاری برگے نالو نگمینگنو دشمن کنی ہرمق سہ کھیونید لے چو امیر حیدر
یاری بلانا چھوقفہو دنا ناغونی آنو سکوری لے چو امیر حیدر

۳۔یری رینگ چنی خاتون کن دشمنی گوستونگ کھیرید لے چو امیر حیدر
چک نہ چکسہ مید پی مندوق کھرینگ آنوے بویانگی چی سترونید لے چو امیر حیدر

ترجمہ۔

۱۔کیا ظلم اور ناانصافی کا دور ہے اے میرے راجہ امیر حیدر، اگر آپ کے اوپر پڑنے والی یہ بلائیں دور ہو سکتی ہوں ،تو یہ جان نچھاور کردوں اے راجہ امیر حیدر۔

۲۔آپ کے برگے نامی نالے سے دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں اے میرے راجہ امیر حیدر، اگر آپ کے اوپر پڑنے والی یہ بلائیں دور ہو سکتی ہوں، تو یہ جان نچھاور کردوں اے راجہ امیر حیدر۔

۳۔آپ کی عزیز خواتین، جن کو دشمن برہنہ سر اسیر کر کے لے گئے ہیں۔ پھول محل میں اب کوئی بھی نہیں۔اس تنہائی میں تم اکیلے کس کی حفاظت کر رہے ہو اے راجہ امیر حیدر۔

اس گیت کے بارے میں یہ واقعہ ہے کہ بلتستان کا ایک راجہ جو امیر حیدر کے نام سے مشہور تھا۔۱۸۴۵ء میں اسے زور آور سنگھ نے سر عام پھانسی دی تھی۔صادق صاحب کے بقول امیر حیدر کے دوتھہ ماں کے زبان سے بے ساختہ یہ

الفاظ نکلے۔ جوامیر چولوک گیت کے نام سے مشہور ہوا۔

اس گیت میں اردو/ فارسی کے الفاظ ظلم، امیر، حیدر، دشمن، خاتون وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

بلتی زبان میں گیت کا ذخیرہ ہے۔ کاظمی صاحب نے ''بلتی لوک گیت'' کے نام سے پوری ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب بلتستان کے علاوہ لداخ بلکہ پورے برصغیر میں مشہور ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے تاریخ بلتستان کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد موسیقی اور لوک گیت کے حوالے سے بحث کی ہے۔

دیوان

لغوی اعتبار سے شاعر کے کلام کا مجموعہ، دیوان کہلاتا ہے اصطلاحاً شاعر کے کلام کا وہ مجموعہ جو حروف تہجی کے مطابق، قافیہ یا ردیف کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہوا سے دیوان کہا جاتا ہے۔ لیکن بلتی زبان و ادب میں اسے ایک صنف کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔ غلام حسن حسنی لکھتے ہیں۔

''آج سے ایک صدی پہلے بلتستان فارسی کے زیر اثر آ گیا۔ لوگ فارسی زبان کے شعراء کو پڑھتے تھے۔ موسیقی کی محفلوں میں بلتی غزلوں اور لوک گیتوں کے ساتھ ساتھ دیوان حافظ وغیرہ سے فارسی غزلیں بھی گائی جاتی تھیں۔ اس طرح بلتی میں دیوان کے نام سے ایک صنف نظم وجود میں آ گئی۔ بلتی زبان میں یہ ایک ایسی صنف شاعری ہے جس کے اشعار بحر کے لحاظ سے تقریباً غزل سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن ایک دیوان کے تمام اشعار میں قافیہ و ردیف کا ہونا ضروری نہیں۔ یہ صنف شاعری بلتی نیم کلاسیکی ادب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ بلتی ادب کے نقاد اسے ''برخلو'' یعنی درمیانی گیت کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ تاریخ لداخ کے مصنف کاچوسکندر نے اپنی کتاب میں دیوان کو ''پھرہ خلو'' لکھا ہے۔ بلتی موسیقی کی محفلوں کا آغاز پہلے لوک گیت پھر دیوان اور آخر میں غزل سے کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے اس صنف شاعری کو ''برخلو'' کا نام دیا گیا ہے۔ (نگارشات، ص ۱۱۹)

دیوان میں رومانوی، تاریخی اور عشقیہ یا جدائی کے موضوعات پیش کئے جاتے ہیں۔ بلتی رومانوی شعراء نے پھول کی شاخ اور عورت کے جسم کو زندگی کے متحیر کن اسرار میں شمار کیا ہے۔ بلتی رومانوی دیوان میں عورت کی شخصیت اور اس کی پراسرار کیفیات کی ترجمانی احسن طریقے سے کی گئی ہے۔

حسنی صاحب نے بطور مثال ''غونی موے دنیا'' کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ''غونی مو'' اردو میں پگلی دکھیا، الم نصیب اور بے چارے ستم دیدہ کا مترادف ہے۔ یعنی میں قسمت جلی وغیرہ وغیرہ۔ بلتی ماحول میں غم زدہ خواتین کی زبان پر عام طور ''غونی'' لفظ ہوتا ہے جسے عام گناہ یا برائی کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ''غونی مو'' کنایتہً استعمال ہوا ہے۔ دراصل یہ لفظ ایک مفروضہ ہے۔ خواتین

فرض کر لیتی ہیں کہ ''میں دکھیا، میں بدقسمت عورت ہوں'' جبکہ حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہوتیں''۔ا

تم پو چک ان معنی ستونگ ستونگ یود پی

خلوژھیر چک کو چوکتوک

یولا یانی سنا بیوس

منگمو جوفول بے ہنہ سکد مید ہنہ صورت مید

دولہ یری فیا قیو بخشش بیوس

ینگ پو ینگ شخفی وخلہ ستود کھا منگمو

بیاس زیرے کوس جر بہ نی سنولہ

یوکوسناسی ناکھون مہ کھور بہ درہ ژھودی

نلہ غدیا نگمہ یود پا گسپی وخلہ

یاٹی سی غدیا نگ بیک زیرے

امہ مابیاس غدیا نگ چی

لے ستروغی مایون ستر گہ تھونگفی سیکھا

ماچو سنارے شیزدہ تایاٹی ژھینگ چی

یودنلہ دقسن

ژرنہ موتک ژوخ یود پی ہسو تھونگسے

نی ستروق لہ گویدلے غونی موے دنیا

ترجمہ۔

بات ایک ہے لیکن ہزاروں مفاہیم پر مشتمل ایک مصرعہ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔سماعت فرمایئے۔میں لب کشائی کرتا لیکن میری آواز میں نہ دلکشی ہے اور نہ میری جاذب نگاہ صورت ہے۔اس کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔

میری اندھی سماعت تک یہ بات پہنچی کہ آپ نے رقیبوں کی خوب خوب تعریف کی ہے۔یہ سننے کے باوجود بھی میں نے دل میں رشک وحسد کو کبھی جگہ نہیں دی۔مجھے اپنے ہم جولی سے بڑی امیدیں اور توقعات تھیں کہ بڑھاپے میں

میرے ساتھ وفا کریں گے لیکن صد افسوس وعدے وفا نہ ہوئے۔

اے روح مایون آپ سے التجا ہے کہ اخروٹ کے ہر درخت پر آشیاں نہ بنائیں۔آپ کی حسین انگلیوں سے لگائی ہوئی ریشمی گرہیں اب بھی مجھ سے نہیں کھل سکتیں۔

آپ کے موتیوں کی لڑی جیسے دندان دیکھ کر میں اب بھی آپے میں نہیں رہتا۔اے ستم دیدہ دنیا!

اس نظم میں اردو/ فارسی کے الفاظ،معنی،صورت اور دنیا شامل ہوئے ہیں۔

چند بلتی دیوان کے نام مندجہ ذیل ہیں۔

۱۔وزیر محمود ۲۔لیاخموسونگ شیخ چی مسنوگ ۳۔چوعلی مرادخان ۴۔چوامیر حیدر ۵۔ستروغی دنیاد ۶۔میںگمو علی یار ۷۔نیم ژھر ۸۔ہلانورگشہ ۹۔رگہ کھن یا نگ لہ ۱۰۔مسود پا ۱۱۔ہائی ہائی لے رگنو۔۲

بلتی اصنافِ شاعری پر چند نکات کو بیان کرنے کے بعد بلتی ادب کے نامور شعراء کے بارے میں مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

حسین علی خان محبّ

حسین علی خان محبّ بلتی زبان کے نامور شاعر ہیں۔محبّ کو بلتی زبان کی صنف مرثیہ میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اردو میں میر انیس کا ہے۔حسین علی خان محبّ رگیا لفو احمد شاہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔محبّ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ابھی پختہ ثبوت دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔البتہ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ ان کی ولادت غالباً ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔ڈوگرہ حملہ بلتستان کے وقت ان کی عمر لگ بھگ دس بارہ سال مانی جاتی ہے۔بچپن سے ہی انھیں شعر وشاعری سے شغف تھا۔ان کی والدہ دولت خاتون تھیں جن کا تعلق بلتستان کے مشہور خاندان اماچہ سے تھا۔یہ خاندان علم وادب کی سرپرستی کے لئے جانا جاتا تھا۔اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کی سرپرستی میں محبّ کے چاروں بھائیوں کو مروجہ دینی ودنیاوی تعلیم فراہم ہوئیں۔اس طرح رگیا لفو احمد شاہ کے چاروں بیٹوں امیر حیدر محزونؔ،لطف علی خان عاشقؔ،ملک حیدر مخلصؔ اور حسین علی خان محبّؔ کو فارسی اور عربی زبان وادب پر کافی عبور حاصل تھا۔محبّ کے تینوں بڑے بھائی مرثیہ گو شاعر گذرے ہیں۔یہی وجہ تھی کہ اس علمی ماحول میں

۱،۲۔پروفیسر حشمت علی کمالؔ الہامی۔ص۵۵۔نگارشات بلتستان یلتستان دائرہ نگارش۔سکردو۔سودے بکس پبلیشر بک سیلر سپلائر علمدار روڈ، سکردو ۲۰۰۵ء،ص:۱۲۳،۱۲۵

محبؔ کو شاعری کا ذوق خاندانی وراثت کے طور پر ملا اور ان کی شاعری انہی بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ صادق ہرداسی کے بقول:

''محبؔ نے زندگی میں اس قدر نشیب و فراز دیکھے کہ ایسا شاید ہی کسی اور شاعر نے دیکھا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ محبؔ کے مرثیوں اور نوحوں میں اتنا سوز و گداز موجود ہے کہ ان کا کلام ان کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے''۔۱

بلتی زبان کی اپنی تنگ دامانی کے باوجود محبؔ کے کلام میں غضب کا رچاؤ، حلاوت، بلا کی برجستگی، انتہا کی روانی، روزمرہ کی چاشنی اور فصاحت و بلاغت کی تابنا کی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی ساری خصوصیات کسی بھی شاعر کو اعلی مقام بخشنے کے لئے کافی ہیں۔

ان کے مرثیوں کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں نظم کی طرح پر تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ جس منظر پر بھی لکھتے ہیں تو اس منظر کے مختلف پہلوؤں کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں۔ انسانی جذبات اور نفسیات پر ان کی فنی گرفت مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ اکثر اوقات ان کی منظر نگاری سے پڑھنے اور سننے والوں کے صبر کے بندٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ ان کے کلام میں بلا کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

صادق ہرداسی لکھتے ہیں'' دنیا کے مختلف خطوں میں واقعہ کربلا کے عنوان پر لکھنے والے بڑے بڑے سخنور پیدا ہوئے ۔اسی طرح لداخ اور بلتستان میں محبؔ اور ذاکر جیسے قادر الکلام مرثیہ گو پیدا ہوئے۔ ان کے مرثیوں اور نوحوں کی گرمی نے قراقرم کی ان وادیوں میں محشر برپا کر دیا۔ آج محبؔ اور ذاکرؔ کو بلتستان اور پرگ میں وہی مقام حاصل ہے جو برصغیر میں انیس اور دبیر اور ایران میں محتشم کو حاصل ہے۔''۲ (۱،۲، بلتی ادب، ص: ۳۳۹، ۳۴۰)

الغرض حسین علی خان محبؔ لداخ اور بلتستان کے بہت ہی مشہور اور معروف شاعر گزرے ہیں ۔بلتستان میں پیدا ہوئے لیکن زمانے کے نامساعد حالات کی بنا پر ان کے خاندان کو بلتستان سے ڈوگرہ فوج نے جموں منتقل کیا اور پھر انہیں ترال لایا گیا یہیں ۱۸۹۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

نمونہ کلام:

لنچہ ز یرس غو بین ا پو چو یری حسین لا شا مپو نی
بیاس دینے خسم بینگ می چھود پی ظلم کن سومید بیاسے

صادق ہرداسی اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ رشتے کے لحاظ سے زینب خود سید الشہدا کی حقیقی بہن تھی تو یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ زینب نے ''نی حسین لا'' کہنے کے بجائے ''ری حسین لا'' استعمال کیا۔ (نی بمعنی میرا۔ اور

یری بمعنی تیرا۔) چونکہ نانا سے شکایت کررہی ہے نا، اس لئے شاید زینب کو یا حضرت محبّ کو یہ خیال آیا ہو کہ پیغمبر اکرم حسین کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔''

اس شعر میں فارسی یا اردو کے دو یا تین الفاظ شامل ہوئے ہیں مثلاً حسین، شام، ظلم۔

راجہ حسین علی خان محبّ بلتستان کے آخری خود مختار تاجدار مقپون احمد شاہ کے بیٹے تھے۔ آپ کی پیدائش اور پرورش و پرداخت اس ماحول میں ہوئی جب خاندان مقپون کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ ۱۸۴۰ء کے جانکاہ حادثہ میں انھیں ڈوگروں کے ہاتھوں اسیر کی حیثیت سے پہلے کشمیر اور کشتواڑ کے قلعوں میں قید رکھا گیا۔ احمد شاہ کی وفات کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ کے حکم سے انہیں سری نگر سے تیس میل دور موضع ترال میں منتقل کر کے نظر بند رکھا گیا اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔

شہزادہ حسین علی خان محبّ نے نعت، منقبت، اور شہر آشوب میں طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ نگاری میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں اس کی نظیر کسی اور بلتی زبان کے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ محبّ بلتی ادب کے پہلے مرثیہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا کا منظر منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ خود بھی ایسے حالات سے گزرے تھے اور ایسے ہی مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہی سبب ہے کہ محبّ کے مرثیوں میں بلا کی تاثیر ملتی ہے۔ بلتی مرثیہ نگاری میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ محمد حسن حسرت لکھتے ہیں:

''یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جو درجہ اردو مرثیہ نگاری میں میر انیس کو حاصل ہے وہی مقام بلتی میں حضرت محبّ کا ہے۔ گویا آپ کا کلام بلتی ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے اور آپ خود فن مرثیہ گوئی کے آسمان کے درخشندہ ستارہ ہیں۔''[1]

محبّ کے مرثیوں اور نوحوں میں اس صنف سخن کی تمام تر خوبیاں یعنی منظر کشی، اثر انگیزی سلاست و روانی اور حفظ مراتب وغیرہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ حضرت محبّ کو شہیدان کربلا سے والہانہ عقیدت تھی۔ ان کے ہر شعر میں حلاوت، سوز و گداز، عظمت و جلالت، غیرت و خودداری، صبر و تحمل اور حسرت و آہ کی دنیا آباد ہے۔ ہر شعر تقاضائے فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے کلام کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ہر شعر سہل ممتنع کا درجہ رکھتا ہے۔ حسن و بیان کا جادو ہی ہے کہ ان کا کلام سن کر یا پڑھ کر کوئی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے کلام کی یہ خصوصیات انھیں ایک عظیم شاعر بناتی ہیں۔ محبّ کی شاعرانہ خصوصیات کے متعلق حسرت صاحب لکھتے ہیں:

''محبّ کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو پڑھنے کے لئے حضرت امیر خسرو کی طرح لے بھی آپنے خود وضع کی ہے۔ آپ کی تصانیف میں شاید کوئی کلام ایسا ہو جس کے لئے خاص طرز وضع نہ کی گئی ہو۔ آپ کی وصیت کے مطابق بلتستان بھر میں آپ کے مراثی اور نوحے مخصوص طرزوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ نیز ان کی طرف سے ان کے کلام کی طرزیں

بدلنے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ محبّ کے کلام کسی اور طرز میں پڑھا بھی جائے تو خاص لطف نہیں آتا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں محبّ علیہ الرحمہ کی وضع کردہ لے اور طرزیں کس طرح بلتستان پہنچیں کیونکہ ان دنوں ریکارڈ ینگ کا تو کوئی ذریعہ میسر ہی نہیں تھا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ بلغار خپلو کے سید محمد اکبر جو نہایت خوش الحان شخص گزرے ہیں کی رسائی کشمیر میں محبّ تک ہوئی اور متواتر بارہ سال تک آپ سے مستفیض ہوتے رہے۔ محبّ نے اپنا کلام مخصوص طرزوں میں سید اکبر کو سکھائے تھے اور سید اکبر جب بلتستان واپس آئے تو انہوں نے ان دلکش و موثر ترین مرثیوں کو محبّ کے اپنے مخصوص وضع کردہ طرزوں میں پڑھنے کا رواج دیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی زبان زدعام ہے کہ سکردو ''نیا نیور'' کے ایک معمر شخص اپو خوشحال بھی ان طرزوں سے بخوبی آشنا تھے جو آزادی سے کچھ عرصہ قبل فوت ہو چکے ہیں۔ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ محبّ کے کلام متداول طریقے سے جمع کر کے محفوظ کرنے کی زحمت اب تک کسی نے بھی نہیں اٹھائی ہے۔ اب مرور ایام کے ساتھ ساتھ ان طرزوں میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی ہے۔ البتہ جرمنی کی ایک خاتون ڈاکٹر سوئنن نے محبّ کے مرثیوں پر تحقیق کر کے کافی طرزیں محفوظ کر لی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انہوں نے چند مرثیے فن موسیقی کی زبان میں ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ بلتستان میں چند بزرگ مرثیہ خواں اب بھی بفضل خدا بقید حیات ہیں جو کم و بیش محبّ کے مرثیوں کی صحیح عبارتوں اور طرزوں سے واقف ہیں۔ ان بزرگوں میں شمیم بلتستانی اور کاچو شجاعت علی خان شجاعؔ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جو آج بھی محبّ کے مرثیوں کو مخصوص طرز میں پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں''۔

(۱،۲۔ بلتستان کے سخن ور، شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار، سکردو، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۶، ۲۸)

شیخ غلام حسین سحرؔ صاحب نے محبّ کے بارے میں صحیح کہا ہے:

کربلا ساری محبّؔ کے مرثیوں میں آ گئی
کربلا پر مرثیہ گوئی محبّؔ کی چھا گئی
کوئی شاعر لاؤ اے رقیبان ازل
جو محبّؔ کا مرثیہ گوئی میں ہو نعم البدل
نہ عرب کی نہ عجم کی نہ ہی ہندوستان کی
خود مثال اپنی ہے آپ تہذیب بلتستان کی۔ ا۔ (سحرؔ)

(حسرتؔ، محمد حسن؛ پیام سحر (مجموعہ کلام شیخ غلام حسین سحرؔ بلتستان بک ڈپو پبلیکیشنز نیا بازار، سکردو بلتستان، ۲۰۱۳ ص: ۲۲۶)

سید عباس علی شاہ الموسوی، معروف بہ ''بوا عباس''

سید عباس علی شاہ الموسوی کا تعلق محلّہ خنامی کا موضع چھور کا وادیٔ شگر بلتستان سے تھا۔ ان کے دادا سید نجم الدین

ثاقبؔ بھی صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔مرحوم کے دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ایک بیٹا منصور علی شاہ شاعر نام آور ہوئے۔تخلص کبھی منصور اور کبھی انا الحق استعمال کیا ہے۔دوسرا بیٹا مبارک علی شاہ شہر دہرادون میں آباد ہے۔

بوا عباس شاعری کے علاوہ درس وتدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔انھیں یہ شکایت تھی کہ شگر میں کسی نے ان کی علمیت سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا۔مرحوم راجہ ناصر علی خان یبگو خپلو کے اتالیق رہے۔کچھ عرصہ بعد درباری سازشوں کے نتیجے میں وہ واپس شگر چلے آئے اور کرسچین مشنری کی مختصر ملازمت کی۔انھوں نے ''بائبل'' کا بلتی ترجمہ بھی کیا۔وہ ایک ماہر خوش نویس بھی تھے۔ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید اور مجمع المسائل کا بلتی ترجمہ اس وقت موجود ہے۔ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔پھر سکردو جا کے اخوند غلام علی سکردوی اور اخوند سلطان علی بلغاری سے علم کی روشنی حاصل کی۔بعد میں عباس مرحوم کی ذاتی صلاحیت اور علمی قابلیت کو اس وقت جلا ملی جب مولانا محمد عمر پشاوری کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔حصول تعلیم کے لیے کبھی سکردو سے باہر نہیں گئے۔مطالعہ کتب میں ہمہ دم غرق رہتے تھے۔کمال علمیت اور آفاقی شہرت ذاتی مطالعہ کتب کا ہی نتیجہ ہے۔

اس زمانے کے شاعروں میں خپلو میں بوا جوہر علی جوہرؔ، کاچو اسفندیار خان، سکردو میں راجہ حسن خان بیدلؔ اور سید فضل علی شاہ موسوی اور شگر میں راجہ مراد علی خان مرادؔ وغیرہ موجود تھے۔جن کی صحبت کمال انھیں میسر تھی۔

بوا عباس کی شاعری میں قصائد (بلتی اور فارسی دونوں زبانوں میں) مثنویاں، نظم (شہر آشوب)، مرثیے، غزلیات اور قطعات موجود تھے۔غزلیات کو انہوں نے خود اپنی حیات میں ضائع کر دیا۔لیکن چند اشعار اب بھی زبان زد عام ہیں۔

نمونہ کلام:۔

نعت رسول مقبول

خضری آب حیات تھونگس نی نبی سکو مسے کھسو

کھوری ابری ھشی کھا باغ جنان بنگسیت سک

ترجمہ:۔حضرت خضرؑ نے بھی آب حیات اس مقصد کے لیے نوش فرمایا تھا کہ لمبی عمر پا کر میرے نبی اکرم کی دیدار کر سکیں اور ریاض خلد بھی حضرت ہی کے ابر رحمت سے سرسبز وشاداب ہے۔

اس شعر میں فارسی یا اردو کے چند الفاظ شامل ہوئے ہیں۔خضر، آب حیات، نبی، ابر، باغ جنان۔

محمد حسن حسرتؔ کے بقول:

''سید شاہ عباس ۱۲۶۱-۶۲ ہجری میں شگر کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے اور بلتستان کے ادبی افق پر آفتاب عالم تاب کی طرح چمکے اور بلتی قصیدہ نگاری میں ملک الشعراء کہلانے کے حقدار بن گئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے پدر گرامی سید قاسم شاہ سے گھر پر حاصل کی۔ بعد میں سکردو آ کر اس وقت کے ممتاز عالم دین اور مدرس بوا پشاور پا کا تلمذ حاصل کیا۔ بوا عباس کی زندگی انتہائی مفلسی میں گزری اور ذریعہ معاش کے لئے جو صعوبتیں اٹھائیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت تکلیف دہ حصہ ہے۔ اس کے باوجود آپ کے ادبی کارناموں میں ضخیم شعری سرمایہ کے علاوہ متی انجیل کا بلتی زبان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ بوا عباس کے مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ان کے کلام میں گل و بلبل کے افسانے اور ہجر و وصال کی داستانیں نہیں ہیں بلکہ ان کے کلام میں امید و رجاء، تہذیب و اخلاق، تعلیم دین و مذہب، پیشواؤں کے ساتھ عقیدت کا برملا اظہار اور تاریخ اسلام کے مختلف گوشے موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عرفانی تصوف کی مہک، اخلاق و نفسیات اور وجدانی علوم کی خوشبو بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بوا عباس کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے اسی سال (یا اس سے زیادہ) گذر چکے ہیں لیکن آپ کا اسم گرامی دنیائے شعر و ادب میں دو حیثیتوں سے یعنی بحیثیت قصیدہ نگار اور بحیثیت مثنوی نگار اب بھی زندۂ جاوید ہے۔ بلتستان میں عام طور یہ بات زبان زد ہر خاص و عام ہے کہ بوا عباس قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ بلتی قصیدہ نگاری اور مثنوی نگاری میں جو قادر الکلامی آپ کو حاصل ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ کا کلام فصاحت و بلاغت، بلندی تخیل، حقیقت بیانی، محاورے، تشبیہات، اوزان و قافیہ کی پابندی اور جوش میں بے نظیر ہے۔

(بلتستان کے سخن ور، شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار، سکردو، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۹، ۹۰)

یری معراجی جغینگ لوقپی رگا نوے میدنارے
ساسہ کھوانگ سیکھ مکھڈ پا یری لزا برانگسید سوک

اے رسول! معراج کے دن اگر آپ کے پاس آنے کی امید نہ ہوتی تو یہ زمین بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر آپ کا پیچھا کرتی۔

حاجی فدا محمد ناشاد لکھتے ہیں:

''سید شاہ عباس اگرچہ قصیدہ گو شاعر تھے۔ لیکن ان کے چند مراثی اور مثنویاں بھی موجود ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ حضرت علیؑ کے قصائد پر مبنی ہے۔ حضرت علیؑ کی شان میں مدح گوئی کرتے ہوئے ایک منزل پر ایران کے مشہور شاعر ملا حسن کاشی نے اپنے ہفت بند میں فرمایا۔

گر بودے بالاتر از عرش برین جائے دیگر
گفتمش آن جاست جائیت یا امیر المومنینؑ

یعنی اگر کائنات میں عرش بریں سے بھی بلند تر کوئی مقام ہوتو یا علی میں آپ کو اس مقام سے نسبت دیتا۔ یہاں بوا عباس علیہ الرحمہ کی تخیل کی بلند پروازی ملاحظہ کیجئے۔

شیرین زبان کاشی دلہفت بند زیرے ننگ
عرشی پہ تھونو ملڑ ھے یار پغزی یو دنرے ینگ
یری ملسہ ناز یرو کپہ سرخد ادیا سنگ
عرشی پہ تہونمو چا میددو دوشِ مصطفیٰ گیگ

یعنی کاشی تو عرش سے بلند مقام تلاش نہ کر سکا۔ لیکن عباس بتاتے ہیں کہ عرش سے بلند تر مقام کیوں نہیں وہ حضور کا مبارک کاندھا ہے۔ جس پر چڑھ کر علی مرتضی نے کعبے کو بتوں سے پاک کر دیا''۔

(بلتستان کے سخن ور،شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار،سکردو،۱۹۹۳ء ص:۷۵،۷۶)

راجہ محمد علی خان ذاکرؔ

راجہ محمد علی خان ذاکرؔ بلتستان کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ آپ کو دبیرؔ بلتسان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ کا نام محمد علی خان اور تخلص ذاکرؔ تھا۔ راجہ محمد علی خان ذاکرؔ کے بارے صادق ہرداسی نے لکھا ہے:

''عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حسین علی خان محبؔ کے بعد بلتی ادب میں ذاکرؔ کے پایہ کا کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اہل ادب اگر محبؔ کو انیس بلتستان مانتے ہیں تو یقیناً ذاکرؔ بھی دبیرؔ بلتستان کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ محبؔ کی طرح ذاکرؔ کے اکثر مرثیے، نوحے اور نعت و منقبت پورے خطہ پرگ (کرگل) اور بلتستان میں زبان زد خاص و عام ہیں اور ہر مذہبی تقریب پر سنائے جاتے رہے ہیں اور عقیدت مندان اہل بیت کے ایمان کو تازہ کرتے رہے ہیں''۔ا

ذاکرؔ بلتستان کے آخری تاجدار رگیالفو احمد شاہ مقپون کے صاحبزادے اور ملک حیدر مخلصؔ کے فرزند تھے۔ رشتے میں یہ حسین علی خان محبؔ کے بھانجے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۸۰ء میں پنیر جاگیر ترال میں ہوئی۔ اپنی پوری عمر انھوں نے یہیں بسر کی۔ کیونکہ ان پر اور ان کے چچازاد بھائیوں پر کشمیر سے باہر جانے کی پابندی عائد تھی۔ بلتستان جانے پر ان پر خصوصی پابندی لگائی گئی تھی۔

صادق ہرداسیؔ لکھتے ہیں:۔

''آخر کار بلتی شعر و ادب کا یہ چمکتا سورج اور مقپون شعراء کی آخری نشانی لگ بھگ ستر سال کی عمر میں ماہ جولائی ۱۹۴۹ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ بزرگان پنیر جاگیر سے معلوم ہوا کہ ان کا جنازہ ایک ماتمی جلوس کی صورت میں نکالا گیا تھا تو

پورے پنیر جا گیر میں ماتم کا سا ماحول چھا گیا تھا۔ مرد وزن اور بچے زار و قطار رو رہے تھے۔'' (۱،۲۔ بلتی ادب، ص: ۳۵۰، ۳۵۵

ذاکرؔ نے مرثیہ نگاری میں جذبہ، عقیدت، محبت، خلوص اور جوش کو بنیادی عناصر کے طور پر استعمال کر کے بلتی مرثیہ نگاری کو نیا افق عطا کیا۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں تشبیہات، استعارات اور محاورات کا عمدہ استعمال کیا ہے۔

بطور مثال:۔

چھوسی ختمی نیمونو بہ چک سکر مہ چوق نو نے

<u>یعنی حرم حسین</u> ستورے <u>پردی</u> نگنہ فیونگس زونے

امام عالی مقام کو فلک دین پر چمکنے والے آفتاب اور پھر اس آفتاب کے غروب ہونے پر پردے میں محبوس اہل حرم کا میدان میں منتشر ہونے کو ستاروں کے نمودار ہونے سے تشبیہ دینا یقیناً ذاکرؔ کے فنی کمال کی گواہی دیتا ہے۔

اس شعر میں اردو، فارسی کے الفاظ، یعنی، حرم، حسین، پردے۔ وغیرہ شامل ہیں۔

بلتستان سے دور ہونے کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو تعلیمی ماحول کے اثرات کی وجہ سے ذاکرؔ نے اپنے کلام میں عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ کا برملا استعمال کیا ہے۔

حیدر خان حیدرؔ

حیدر خان حیدرؔ کی یوم پیدائش معلوم نہیں کی ہو سکی ہے تاہم یہ مانا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۹ء میں آپ کے والد راجہ شگر اعظم خان کی وفات کے بعد نوعمری میں ہی حیدر خان حیدرؔ کو والی ریاست قرار دیا گیا۔ وزیر لکھپت رائے نے دوبارہ سکردو فتح کیا اور غازی حیدر خان حیدرؔ کو پابند سلاسل کر کے جموں پہنچایا اور وہیں قید کر دیا۔ جب ڈوگروں نے اپنی راجدھانی سرینگر منتقل کی تو حیدر خان حیدرؔ کو بھی سرینگر کے زنداں میں منتقل کیا گیا۔ آزادی کا خواب دیکھنے والے غازی کو احساس ہوا کہ غلامی کی زنجیریں پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگئی ہیں۔ بلتستان کا یہ مرد مجاہد تیس سال قید میں رہنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں سرینگر کے زنداں ہری پربت میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔

حیدر خان حیدرؔ کی قوم پرستانہ شاعری نے اس دور کے مظالم کو اجاگر کر کے دور جدید کے ادب شناس لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اسی لئے تقریباً دو سو برسوں کے بعد بھی جب لداخ، پرگ اور بلتستان کے اس دور کے حالات کو سمجھنے کے لئے حیدر خان حیدر کے قلمی کارنامے ایک زندہ حقیقت ہیں۔

نمونہ کلام:۔

<u>روز ازل</u> نہ <u>تا ابد</u> تھونگپہ مید دینے

کہوخ شخنہ کھریل چہ یک زرہ چک میدکھوری ہر مغینگ

اس شعر میں روز ازل، تا ابد، زرہ وغیرہ اردو/فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔

بلتی زبان کے شعراء بھی صنائع بدائع سے خوب واقف تھے۔ بلتی شاعری کے حوالے سے ان کا بیان لازمی ہے۔ حیدر خان حیدر کے حوالے سے محمد شاہ صبا نے ان کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یعنی صبا صاحب نے حیدر خان حیدر کی فن شاعری کے حوالے سے بھی بحث کی ہے لہذا ہم انہیں نمونہ کے طور پر لے کے دیکھیں گے تا کہ بلتی شاعری کو دیگر زبان کی شاعری کے ساتھ پرکھ سکیں۔

یوں تو حیدر خان حیدر کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے لیکن ان کی پوری زندگی کے کارناموں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ضروری امر ہے چونکہ ان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ پہلے حربی طور سے دوسرے ادبی طور پر۔ یہاں ہم ادبی خدمات کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ حیدر خان حیدر کو اپنی قوم کے لوگوں کے دکھ دور کرنے کی وجہ سے جب ڈوگرہ فوج نے انہیں گرفتار کیا اور انہیں جموں لایا گیا تو یہاں سے ان کی قلمی جنگ شروع ہوئی۔ راجہ محمد اعظم خان اماچا نے حیدر خان کی قومی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے:

حیدر خان کی اسیری کی ساتھ ہی بلتستان سے آزادی کی مادی کاوشیں بھی ختم ہوگئیں۔ مگر اس مقام سے جہاں بلتستان کی آزادی کا سفر اپنے انجام کو پہنچا بلتی قومی شاعری کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ بلتی ادب میں حیدر خان وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قومی شاعری کی بنیاد رکھی۔ اردو ادب میں قومی شاعری کی ابتداء حالؔی اور اقبال نے کی چونکہ حیدر خان کی قومی شاعری اور انکی تحریک آزادی اردو کے ان قومی شعراء کی پیدائش سے پہلے کی بات ہے لہذا حیدر خان حیدرؔ کو برصغیر کا بھی پہلا قومی شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب اس کے ہاتھ پاؤں ظلم اور اسیری کی زنجیروں سے باندھ دیے گئے تو اس مرد حریت کی زبان کھل گئی، تلوار چھن گئی مگر قلم نہ چھنی جا سکی اور یہ شاہین اپنے شہپر تخیل پر ادب کی بلند فضاؤں میں محو پرواز رہا۔ (نقیب آزادی، ص:۲۷۳)

حیدر خان کی شاعری میں جہاں غم وغصہ، حزن وملال اور احتجاج پایا جاتا ہے وہیں ان کے کلام میں دلیری اور شجاعت کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں شوکت الفاظ اور شاعرانہ نزاکت خیال کے ساتھ ساتھ فنی محاسن اور صنائع وبدائع کی بہترین مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان کے یہاں سپاہیانہ تیور اور شاہانہ جلال وعظمت بھی مترشح ہے۔ جہاں کمال عجز وانکساری میں مولا مشکل کشاء سے مدد واعانت کا سوال جا بجا دیکھنے میں آتا ہے وہاں انتہائے عشق و عقیدت میں حضرت علیؑ سے گلے شکوے بھی نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ان کی شاعری میں نغمگیت، جوش، غزلیت، منظر

نگاری اور تخیل کی بلند پروازی ہے تو دوسری طرف متعلقہ زمانے کی طرز معاشرت اور معیشت کی وہ عمدہ عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے یہاں قوم کے سیاسی اور سماجی عروج وزوال کی کہانی بھی جلوہ گر ہے۔ یعنی ان کی شاعری کو ایک منظوم تاریخ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ حیدر خان نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو من وعن اشعار کا لباس عطا کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

اس دیدہ زیب اور مزین پیراہن میں جہاں، فصاحت و بلاغت کی رنگینیاں عیاں ہیں وہاں قوم کی بے شعوری اور نا اتفاقی کے غم میں چاک گریبانی اور اپنوں کی غداری، طوطا چشمی اور مصلحت اندیشی کے کرب سے دریدہ دامنی بھی نمایاں ہے۔ اور اس پیراہن کاغذی کے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں فاصلہ اس قدر مختصر ہے جتنی ان کی شاعری ، کیونکہ حیدر خان نے مشق سخن اپنی اسیری کے بعد شروع کی۔ ابتدائی ایام اسیری میں کافی عرصہ حیدر خان قید تنہائی کا شکار رہا۔ مشق سخن انہیں ایام میں شروع کر دی تھی۔ کچھ عرصہ حیدر خان کو بھی رگیا پھوا حمد شاہ کے بیٹوں کے ساتھ اکٹھے قید رکھا گیا۔ اس طرح حیدر خان کو بلتی ادب کے چند نامور شعراء سے ہم نشینی بھی میسر آئی جس کی وجہ سے حیدر خان کو شاعری پر عبور حاصل کرنے میں کافی آسانی اور مدد حاصل ہوئی۔ نامور شعراء میں احمد شاہ مقپون کے بیٹے حسین علی خان محبّ، لطف علی خان عاشق، ملک حیدر مخلص اور امیر بیدل شامل ہیں۔ جو حیدر خان سے پہلے ۱۸۴۰ء سے ہی قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ نامور شعراء نہ صرف ملک حریت کے پہنائیوں میں چمکنے والے درخشندے ستارے تھے بلکہ بلتی زبان وادب کے آسماں پر بھی انتہائی آب وتاب کے ساتھ ضوفشاں تھے۔ بلتستان کی تاریخ ان کی جراءت حب الوطنی اور جذبہ حریت کے واقعات اور ملک وقوم کے لئے ان کی خدمات کو سنہرے حروف میں رقم کرتی رہے گی۔

ان موزوں طبع حلقہ احباب، جراءت منداور بلند حوصلہ ساتھیوں، اور بے شعوری سے نالاں غم گساروں، تدبرو ذکاوت میں ممتاز سالاروں کی صحبت میں حیدر خان نے شاعری کو خوب چمکایا۔ حالات وواقعات کی تلخ وشیرین یادوں نے نفسیاتی ردعمل کے طور پر ''جلتی پر تیل کا کام کیا'' اور حیدر خان کے لئے میر تقی میر کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد وغم اتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حیدر خان کی شاعری خالصتاً نفسیاتی ردعمل کا شاخسانہ ہے ان کے شعری مجموعے میں ایک مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات، دس قصائد حضرت علی ابن ابی طالب کے حضور، ایک قصیدہ حضرت امام علی رضا کی شان میں اور دو قصائد بالترتیب مالک اشتر اور ابرہیم اشتر کے بارے میں موزوں کیے گئے ہیں۔ جبکہ پانچ مراثی خود حیدر خان کے ذاتی ہیں اور

مزید دو مرثیے کلام اجتماعی (یعنی احمد شاہ کے بیٹوں نے بھی دو دو اشعار کہے ہیں) ہیں یہ بھی مجموعے میں شامل ہیں ۔قید تنہائی میں تحریک آزادی کا لمحہ لمحہ حیدر خان کے پردۂ شعور پر ایک فلم کی طرح چلتا رہا جب تصور میں جانثاروں کے جذبہ جہاد، جانثاری، وفاداری، حب الوطنی، خلوص، بلند ہمتی اور قربانیوں کا عکس ابھرتا وہاں حیدر خان پھر آزادی کے لئے مچلتا ۔آزادی کی دلہن غلامی کے تاریک دریچوں سے امید کی مسکراہٹیں بکھیرتی خود اپنی جانب جھانکتے ہوئے محسوس ہوتی ۔ایسے میں حیدر خان کا چہرہ تمتما اٹھتا اپنی مادر وطن کی آزدی کے لئے تڑپتا، وطن کی محبت دل میں انگڑائیاں لینے لگتی ۔اپنے وفادار اور جان نثار ساتھیوں کے خلوص اور محبت کی ملاحت سے بھرپور چہرے حیدر خان کی آنکھوں میں گھوم جاتے ۔ایسے میں حیدر خان بے ساختہ پکار اٹھتا ۔

زگغید نا حضرت ریئچن حسنؑ نا
لغورتھو کچوک زیرے ناری وطن نا
ژھیر یدکھور پہ دپا پھیوخ نارگہ کھن نا
خدا یا درا مبیوس نا نیسپہ چن نا

ہرکونگ گوے بورنیا پھیونگسے کھیری یری شکھو لی نہر

ترجمہ:۔ یا جامع المصترفین ! میں آپ کو مسموم جفا حضرت شبر کا واسطہ دیتا ہوں ۔فوری طور پر مجھے اپنے وطن پہنچا دیں ۔ مجھے اپنے دوست ہمدرد وخیر خواہ بہت یاد آتے ہیں ۔خداوندا! ہم گنہگاروں کو بخش دیں ۔ (نقیب آزادی، ۲۷۷)

اس شعر میں حضرت، حسن، وطن اور خدا اردو/فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔

حیدر نے صنائع بدائع کا خوب استعمال کیا ہے ۔اس کی مثال ملاحظہ ہو ۔

منتخپو تقسے کھوا نگلا گلاب کھوے شٹرونی ژھوق
تھیقپی سینی لونو نگلا زوگید تا مہ یوق پہر
شخمیدی خلونگچہ اونگسے بیا سید بلتی یولپو تھنگ

ترجمہ: اس نے اپنا نام تو گلاب رکھ لیا ہے لیکن اس کی ٹہنیوں کے کانٹے ہمارے صبر وتحمل کے قلب وجگر کو چبھتے ہیں ۔پہر بھر میں ان کو ختم کیجئے ۔ظلم وستم اور جبر وتشدد کے ایک طوفان نے بلتستان کو ویرانہ بنا دیا ہے ۔اپنے کرم کی ایک سر بند باندھ کر اپنے فضل وکرم کی ایک نہر جاری کریں ۔

اعظم خان اما چا کے بقول :۔

''فنی لحاظ سے اس شعر میں مہاراجہ کے نام میں لفظ گلاب کی مناسبت سے اس کے ظالمانہ حکومت کی تشبیہ ٹہنیوں پر اگے ہوئے کانٹوں سے دینا اور دوسرے مصرع میں دل کی تشبیہ پتوں سے دیگر چھبنے کا ذکر کرنا اور پورے شعر میں اس کی نام کی مناسبت سے ایسے مناسب الفاظ کا لانا جن کا آپس میں ایک دوسرے سے تعلق ہو۔ جیسے گلاب، ٹہنی، کانٹے، پتے اور چبھنا وغیرہ صنائع معنوی میں صنعت ایہام تناسب کہلاتا ہے۔ جس کی تعریف یہ ہے کلام میں ایسے دو الفاظ لائے جائیں جن میں ہر ایک کے دو معنی ہو ایک مقصود دوسرا غیر مقصود ہوں وہ دوسرے لفظ کے معنی سے مراعات النظیر ومناسبت کا تعلق رکھتے ہوں۔ (نقیب آزادی، ص:۲۸۱)

صنعت سیاق الاعدد۔

کلام میں اعداد کا ذکر بالترتیب یا بغیر ترتیب کے کرنا جیسے ؎

حسینؑ ڑگیل پھوانگ شہید ہفتاد و دوی پھیا

جق پنج تن ناھلژ ہمہ رگوی پھیا

ترجمہ: سید الشہد احسین ابن علیؑ کے علاوہ ان بہتر (ستر اور دو) شہدا کی خاطر۔ پانچ تن اور دیگر نو معصومین کے لئے۔

صنعت مراعاۃ النظیر

رینچن و لی عز و جل مرتضٰی علیؑ

مشکلی ژھو یکھ کشتی حل مرتضٰی علیؑ

ترجمہ: خدائے عز وجل کے پیارے ولی مرتضی علی ہیں۔ وہ مرتضی علی جو مشکلات کے سمندر میں حل کی کشتی ہے۔

یعنی ایسی اشیاء کا ذکر کرنا جن میں تضاد کے علاوہ کوئی اور مناسبت ہو۔ اس شعر میں ''مشکل'' اور ''حل'' متضاد ہیں جب کہ ''ژھو'' یعنی جھیل سے کشتی کو مناسبت ہے۔ اور ساتھ ساتھ حضرت علی کی معروف اور مشہور صفت اور خطاب ''مشکل کشا'' کی طرف بھی مناسبت ہے۔

حسن تعلیل

کعبہ کھور ینگ سکیسے نا نجف شیچھی زدوک کھورے

یو دگو نمہ نقپو نہ حجری کھہ ر د و نینچہ برنگ

ترجمہ:۔ کعبۃ اللہ س مصیبت میں کہ آپ اس کے اندر پیدا ہو کر ہمیشہ کے لئے نجف اشرف چلے گئے ابھی تک

کالے لباس میں ملبوس پتھر سے سینہ کوبی کر رہا ہے۔

اماچا صاحب حیدر خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔ حضرت علیؑ کا تولد خانہ کعبہ کے اندر ہوا لیکن شہادت کے بعد نجف اشرف جا کر دفن ہوئے۔ لہذا حضرت علیؑ کا قیام مستقل طور پر خانہ کعبہ میں نہ ہو سکنے کے غم میں خانہ کعبہ آج بھی کالے کپڑے پہنے ماتم کناں اور غلاف کعبہ حجر اسود کیساتھ ٹکرا ٹکرا کر سینہ زنی کرتا رہتا ہے۔ یعنی غلاف کعبہ کے سیاہ ہونے کو علامت غم کہنا اور ہوا کے چلنے سے غلاف کعبہ کے پھڑ پھڑانے کو سینہ زنی قرار دینا ایک شاعرانہ نزاکت خیالی ہے۔ دراصل غلاف کا سیاہ ہونا ایک قدیم مروجہ رسم اور غلاف کے پھڑ پھڑانے کا سبب دراصل ہوا کا چلنا ہے۔ یہی نزاکت خیال اور عمدہ تشبیہ صنائع معنوی میں صنعت حسن تعلیل کہلاتی ہے۔ یعنی کسی صنعت کی زیادتی ثابت کرنے کے لئے اس کے اصل سبب کے بجائے کسی لطیف بات کو اس کا سبب قرار دینا جو دراصل اس کا سبب نہ ہو۔

صنعت استخدام

ہر مق برونگ نیسینگنا یمبو گو چوکس ز' دا پو مرحبا

مرحب تھنینگنو پھشقسے نا اے شیر روز جنگ

ترجمہ: دو فوجوں کے اژدہام سے ''مرحبا'' کا نعرہ لگوایا۔ مرحب کو میدان جنگ میں چیر کر۔ اے میدان دغا کے شیر۔

حیدر خان فرماتے ہیں کہ اے شیر روز جنگ آپ نے مرحب کو میدان جنگ میں چیر کر فریقین یعنی لشکر اسلام اور لشکر یہود دونوں کو مرحبا کہنے پر مجبور کیا۔

اماچا صاحب لکھتے ہیں کہ۔ کلام میں ایک دو معنی والا لفظ بول کر اس لفظ سے پہلے ایک معنی مراد لینا پھر اس کی طرف جو ضمیر راجع کرے اس سے دوسرے معنی مراد لینا صنائع معنوی میں صنعت استخدام کہلاتی ہے۔ جیسے اس شعر میں لفظ ''مرحبا'' دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک اسلامی فوج کی طرف سے حضرت علی کی فتح پر صدائے تحسین بلند کرتے ہوئے 'مرحبا' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ یہی لفظ دوسری جانب سے ان کے نامور پہلوان مرحب کے قتل پر بطور ندائے حسرت و یاس اور بین کے مرحب کا نام لیتے ہوئے مرحبا بطرز واحسرتا استعمال ہوا ہے۔

اماچا صاحب کے بقول۔ حیدر کی قادرالکلامی کا اندازہ ایک مرثیے کے دو اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ قصائد کے مقابلے میں حیدر نے بہت کم مرثیے موزوں کیے ہیں۔ لیکن مرثیہ گوئی میں بھی سوز کے ساتھ شوکت الفاظ اور برجستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا جبکہ مرثیوں میں بھی جا بجا صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے۔ اور اتنی آسانی سے کیا ہے

کہ مرثیہ کے سوز پر بالکل اثر انداز نہیں ہوا۔ مرثیہ کے اس بند میں صنائع معنوی کے صنعت ارصاد یا تسہیم کا استعمال ہوا ہے۔

صنعت ارصاد یا تسہیم

یعنی نظم کے آخری جزو سے پہلے ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے معلوم ہو جائے کہ اس فقرے یا شعر میں کیا قافیہ نظم ہوا ہے۔ بولتا قافیہ بھی اسی کو کہا جاتا ہے۔ جیسے

سا قی کو ثر بی بو گمو چھو ی تکچہ پھیلا
بوکھورے چھوڑ لبا شنچھی شا حسین خسمسے نوشیک
حضرت پیغمبری ا ما تی نیسپو نی تر ینو نگ
کھوے زدوگی مکچھو یکھ دقپھی شا حسین خسمسے نوشک

ترجمہ: اس حسینؑ کی یاد میں اشک بہاؤ جو ساقی کوثر کا بیٹا ہو کر ایک بوند پانی کی تلاش میں ننھے بچے کو ہاتھوں میں لے کر نکلے۔

اس بادشاہِ دو جہاں حسینؑ کے غم میں رو لو۔ جس کی مصیبت میں بہائے ہوئے آنسوؤں کے قطروں نے پیغمبرؐ اسلام کی امت کی گناہوں کے میل دھو ڈالے۔

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں ''ساقی کوثر بی بو'' یعنی ساقی کوثر کا بیٹا ''گمو چھوی تکچہ پھیلا'' یعنی ایک قطرہ ٹھنڈے پانی کے لئے، یہ مفہوم لانے کے بعد قافیہ سے پہلے ''چھوڑ لبا'' یعنی پانی مانگنے کا ذکر کر کے ''شنچھی'' یعنی تشریف لے گئے کا لفظ بولنے سے پہلے ذہن میں آجاتا ہے جو کہ اس شعر کا قافیہ ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں لفظ ''ترینونگ'' یعنی میل کے بعد ''مکچھو یکھا'' یعنی آنکھوں کے پانی سے کا لفظ بول کر شعر کا قافیہ ''دقپھی'' یعنی صاف ہوا (دھویا) کا لفظ بولنے سے پہلے ہی سامع کی زبان پر بے ساختہ نکل آتا ہے۔

صنعت مبالغہ

مبالغہ بھی کلام میں ایک بڑی صنعت ہے۔ اور بلاغت کا حصہ ہے اس کی کئی اقسام ہیں مثال کے طور پر غلو اور اغراق کو لیا جا سکتا ہے۔ حیدر خان کے کلام سے بطور نمونہ دو مثال ملاحظہ ہو۔

غلو

سینگیو لا تھو نگسے ہر پو کسے کھیو نید پا ھشو شی کھا

چھونگ ریس خسومیکھا تھنگپو چڈے شوخنا کھوی سپیہ ننیگ

ترجمہ: جب شیر نے دیکھ لیا تو اس قدر ہیبت ناک انداز میں حملہ آور ہوا کہ اس کی تیزی اور سبک قدمی نے میدان کو تین جست میں عبور کرلیا۔فرماتے ہیں کہ شیر غصے میں اپنی چستی اور تیزی سے اتنے بڑے میدان کو تین چھلانگوں میں پار کرتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں لیکن شاعر نے شیر کے غصے، چستی اور تیزی کو انتہا تک پہنچانے کے لئے صنعت مبالغہ سے کام لیا اور اس میں غلو کا استعمال ہے۔غلو وہ مبالغہ ہے جو عقلاً و عادتاً محال ہو۔

اغراق۔

خچن پھر لا مید پہ چنگ سا بشن لور بق چہ زے

سپنلکو منید پا لور بغی پھر ونگ لا کھوے لبن

ترجمہ:۔عدل و انصاف کا ماحول ایسا کہ کسی درندے کو بھیڑ بکری کھانے کی مجال نہ تھی۔ گویا بھیڑیا نہ تھا۔ بلکہ بھیڑیا، بھیڑ بکری کے ننھے بچوں سے اپنی زبان چسا تا تھا۔

یعنی ایسا عادلانہ نظام کہ بھیڑیے کی کیا مجال کہ وہ کسی مویشی کو کھالے اور مادہ بھیڑیے، بکری کے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔صنعت مبالغہ میں اغراق کہلاتا ہے۔یعنی وہ مبالغہ جو عقلاً ممکن ہو لیکن عادتاً ممکن نہ ہو۔

صنعت تلمیع

یعنی ایسے اشعار لکھنا جن کا ایک حصہ ایک زبان میں اور دوسرا حصہ کسی اور زبان میں ہو۔جیسے۔

نوروزی جق لا شیر خدا بیونگسے تخیکھ

شد تازہ تر زمین و زمن از غم کہن

ترجمہ: یکم حمل کو جب شیر خدا تخت خلافت پر متمکن ہوئے تو زمین و زماں دیرینہ غموں سے نجات پا کر پھر سے تازہ وتر ہو گئے۔

صنعت تلمیح

کلام میں اگر کسی مشہور تاریخی واقعہ یا قرآنی آیت کے کسی مخصوص ٹکڑے یا حدیث پاک کے کسی مخصوص حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہو تو صنائع معنوی میں اسے صنعت تلمیح کہا ہے۔حیدر خان ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

نیسپی محیطی سکل لانیانو بسے یودنا سانگ

دوکسے نچسے چے نیالانیو نوحی یانگ ھلتنے

ترجمہ:۔گرچہ ہم گناہوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن ہمیں سفینہ نوحؑ کے متبادل آپ کی ذات کی نشان دہی ہو چکی ہے۔

اماچا صاحب لکھتے ہیں کہ شاعر نے شعر میں رسول اکرم کی مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اہل بیت اطہارؑ کو سفینہ نوحؑ سے تشبیہ دی ہے یعنی ذریعہ نجات۔

صنعت تعجب

کسی فائدے کی غرض سے اظہار تعجب کرنا۔ جیسے حیدر خان فرماتے ہیں۔

خوجابیسا ژونی تھکھ لین لوچک لونیسپچہ یل بارے

بشن ارض وسما نیسکوے یرنیگنو دوگسے بگیل بارے

ترجمہ:۔اگر مالک اپنے غلام کی وفاداری کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو ایک دو سال کی قید بہت تھی۔اس قدر کٹھن امتحان حیرت کی بات ہے حالانکہ آپ کے ہاتھ میں ارض وسماء کے اختیارات ہیں۔

اماچا صاحب لکھتے ہیں:۔حیدر خان کی شاعری کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر خان فنی محاسن، صنائع و بدائع اور عروض وقوافی کے سارے علوم سے پوری طرح واقف تھا۔ یہ چند اشعار حیدر خان کی شاعری میں فنی محاسن کے بیان میں بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ جبکہ ان کا پورا مجموعہ کلام فنی محاسن سے بھرا پڑا ہے۔ان کے کلام سے ان کی وسعت مطالعہ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ان کو دینی علوم، اسلامی تاریخ کے علاوہ فن حرب اور فن جہانبانی پر بھی عبور حاصل تھا بلکہ با قاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ان کے کلام سے دنیا کے مشہور حکمرانوں اور بادشاہوں کے حالات سے مکمل واقفیت اور عظیم سالاروں اور مشہور جنگجوؤں کے بھی مکمل حالات سے واقفیت اور معلومات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ایک جگہ اپنے آقا حضرت علیؑ سے انتہائی عشق وعقیدت کا اظہار ایک مستزاد میں اس طرح کرتے ہیں۔

قیصر نہ کھو خاقان دی دنیائی کھری ژگیلفونگ ھفت کشوری ذچونگ

مید ماری قنبر زگوتھیمی ژون چہ ناپے سپے یا شاہ غضنفرؑ

سنینگ چن ناکھیوغونگ چلتو دے رستم نہ فریدون بیژن نہ کھو سہراب

مید کھونگ سو یری مالک اشتر نہ تھینگ ز دے یا شاہ غضنفرؑ

ترجمہ:۔اے شیر کردگار! قیصر و خاقان جیسے بادشاہ جو ہفت کشور کے مالک ہیں۔آپ کی درگاہ کے غلام قمبر کے برابر نہیں ہیں۔

اے شیر پروردگار! دنیا کے نامور اور سربرآوردہ پہلوانان رستم، فریدوں، بیژن اور سہراب میں سے کوئی بھی میدان جنگ میں آپ کے مالک اشتر کا مدمقابل نہیں ہیں۔

حیدر خان کی شاعری گو کہ مناجات، قصائد اور مراثی کا مجموعہ ہے لیکن ان نمونہ ہائے کلام میں غزلیت بھی جابجا نمایاں ہے۔جیسے ایک مستزاد میں اپنے آقا حیدر کرارؑ سے اس طرح التجاء کرتے ہیں۔

نی ستروغی بیا بیو بوس مچوگی پنچدی ژیلبو ینگ یا شاہ غضنفرؑ

یسچوک غدیانی میندو قپور گنوے دروم شونا ژھر بو ینگ یا ساقی کوثرؑ

ترجمہ۔اے شیر خدا! میرے طائر روح کو رنج و مصیبت کے قفس میں پڑا رہنے نہ دیں اے ساقی کوثر! میری امیدوں اور آرزوؤں کے پھول کو مسرت و انبساط کے چمن میں کھلنے دیں۔ (نقیب آزادی:۲۸۴،۲۹۵)

ان کے علاوہ حیدر خان وقعات، تواریخ، سیاسی نشیب و فراز، طرز بود و باش اور رسم و رواج کو بھی بڑی خوبصورتی اور آسانی سے نظم کرتے ہیں۔اگر ان اشعار کو جن میں حیدر خان نے تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے منتخب کر کے ترتیب دیا جائے تو ۱۸۴۲ء کی تحریک آزادی کے مکمل تاریخی پس منظر، اس زمانے میں بلتستان کے سیاسی حالات، گلاب سنگھ کے ظالمانہ نظام حکومت، خامیاں اور ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی اور معاشی بدحالی کی صحیح عکاسی کی جاسکتی ہے۔

حیدر علی خان حیدر کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے فنی محاسن کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بلتی ادب میں بھی فن شاعری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

بوامنصور علی

مورخین کے مطابق سید منصور علی شاہ، سید شاہ عباس شگری کے فرزند تھے۔ان کو کربلائے معلیٰ کی زیارت کی تمنا کس حد تک تھی، اس کا اندازہ ان کے لکھے ہوئے قصائد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔شملہ، امباڑی، کالسی اور چکروتہ میں مقیم بلتی بزرگوں سے ملی جانکاری کے مطابق بوامنصورؔ ملازمت چھوڑ کر بلتستان سے زیارت کربلا کی نیت سے براستہ بانڈی پور کشمیر وارد ہوئے۔بانڈی پور سے بذریعہ کشتی سرینگر ڈل گیٹ پہنچے۔کہتے ہیں کہ اس پوری رات بھر کے کشتی کے سفر کے لئے بانڈی پورہ سے ڈل گیٹ تک کا کل کرایہ مبلغ ایک روپیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ان دنوں مہاراجہ کشمیر کی ملازمت کے سلسلے میں سینکڑوں بلتی کشمیر میں رہائش پذیر تھے۔بوامنصورؔ کی کشمیر میں آمد کی خبر پھیل چکی تھی۔ترال پنیر میں رہائش

پذیر مقبول خاندان کے بزرگ شاعر محمد علی خان ذاکؔر تک جب یہ خبر پہنچی تو محمد علی خان ذاکؔر، جنھیں دبیؔر بلتستان کے نام سے جانا جاتا ہے، ڈلگیٹ کے مقام پر بوامنصور کے استقبال کے لئے حاضر ہوئے۔ کشمیر میں مقیم آبادی نے ڈلگیٹ میں بوامنصور کا والہانہ استقبال کیا اور محمد علی خان ذاکؔر جو اپنے ساتھ ایک اور گھوڑا اس غرض سے لائے تھے کہ بوامنصوؔر کو ترال میں مدعو کریں گے۔ بومنصور ان کی دعوت کو انکار نہ کر سکے اور ترال کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں بٹوارہ کے مقام پر محمد علی خان ذاکؔر اور بوامنصوؔر میں گفتگو شروع ہوئی۔ بوامنصور نے جب اپنے سفر کربلائے معلیٰ کے بارے میں محمد علی خان ذاکؔر کو بتایا تو محمد علی خان ذاکؔر نے جواباً بتایا کہ حکومت وقت سے اگر اجازت ملے تو میری بھی یہی تمنا ہے کہ میں بھی زیارت امام عالی مقام کے لئے رخت سفر باندھوں، کیونکہ راجہ محمد علی خان ذاکؔر کے خاندان پر ڈوگروں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ بلتستان کے یہ شہزادے اسیری میں بھی کہیں ان کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے محمد علی خان ذاکؔر کی خواہش جاننے پر بوامنصور کی شاعری کا مزاج بن گیا کہ زیارت کربلا کا۔ سرینگر سے پنیر ترال کے پینتالیس کلومیٹر کے سفر کے دوران بوامنصوؔر نے ایک قصیدہ مکمل کر لیا جس کا ایک بند کچھ یوں تھا۔

دونگ کربلا لے بلبل کھینگ نانیسکوفر وا ین

لقستو نگ پوگوا کھر لید نا بلٹن میگی چھیموا ین

اس شعر میں اردو/فارسی کے الفاظ کربلا اور بلبل استعمال کئے گئے ہیں۔

اس شعر میں بوا، ذاکر کو بلبل سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہمسفر بن کر کربلائے معلیٰ کی زیارت کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ کاچو اسفند یار خان، آخوند خدایاؔر، راجہ حاتم خان حاتم، سید محمد اکبر، کاچو مراد علی خان مراؔد کھرمنگ، آخوند محمد علی، راجہ امیر حیدر مخلص، مراد علی خان مراؔد اماچہ، جوہر علی جوؔہر، سید سلطان شاہ، وزیر رستم ولی پا، راجہ محمد علی شاہ بیدؔل، آخوند حسن، حاجی غلام حسین، آخوند حسین، سید علی شاہ رضوی، مظفر علی خان ظفؔر، سید ناصر الدین ناصؔر، محمد حسین خان حسیؔن، محمد علی خان واحد، فدا حسین شمیؔم، غلام حسن حسنؔی، حاجی غلام حسن طالب، غلام مہدی مرغوؔب، کاچو شجاعت علی خان شجاؔع، راجہ حامد حسین کلیم، حاجی غلام محمد بسمؔل، وزیر احمد علؔی، راجہ محمد علی شاہ صبؔا وغیرہ قابل ذکر مشہور شعرائے بلتستان ہیں۔

بلتستان کے چند نامور ادیب جنہوں نے اردو اور بلتی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور نثر لکھی ہے ہم ان کا یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔

فدا حسین شمیم بلتستانی

شمیم بلتستانی بلتستان کے نمائندہ نامور شاعر اور معروف ادیب ہیں ۔اردو، فارسی اور بلتی زبانوں میں شاعری کرتے ہیں ۔ظاہر ہے کہ تین زبانوں میں شاعری کرنا آسان کام نہیں ہے ۔انہیں نظم اور نثر دونوں پر یکساں عبور اور دسترس حاصل ہے ۔وہ بلتستان کی قدیم تہذیب وثقافت کی یادگار اور پرانی روایت کے امین ہیں ۔شمیم صاحب فن موسیقی میں بھی ماہر ہیں ۔بلتی قدیم مراثی ،نوحہ جات ،غزلوں اور گیتوں کی طرزوں سے خوب آگاہ ہیں ۔نظم اور نثر میں ان کی اہم تصنیفات وتالیفات یہ ہیں ۔ چراغ مصطفوی، آئینہ بلتستان، اصلاح معاشرہ، برڑق شنگ ، یاز مانینگ تھونگ ، بنائے لاالہٰ ،افکار شمیم، مقصد شہادت، عکس جمیل، سیف وقلم ، بلتستان نامہ عقیدت ۔

راجہ محمد علی شاہ صبا

راجہ محمد علی شاہ صبا بلتستان کے معروف راجہ خاندان ''اماچہ'' کے چشم و چراغ ہیں ۔ان کے خاندان میں راجہ حیدر خان اور راجہ مراد فارسی اور بلتی زبانوں کے معروف شاعر گزرے ہیں ۔راجہ صبا کا کہنا ہے راجہ مراد علی خان مراد بلتستان سے اردو کے پہلے شاعر ہیں ۔راجہ محمد علی شاہ صبا اردو، فارسی اور بلتی زبانوں کی تمام اصناف شاعری کے قادر کلام شاعر ہیں ۔وہ نظم اور نثر میں یکساں مہارت رکھتے ہیں ۔راجہ صاحب پولو کھیل کے بہترین کھلاڑی اور نامور شہسوار ہیں ۔صبا صاحب بلتی موسیقی کی تمام دھنوں میں موجود لوک داستانوں ، واقعات، پیغامات اور اشارات وکنایات کے خوب رازدان ہیں ۔''گل عباس'' اور ''بلتی ،اردو لغت'' ان کی معروف تالیفات ہیں ۔

محمد حسن حسرت

محمد حسن حسرت بلتستان کے علمی ،ادبی ،فکری، تحقیقی ،تنقیدی اور تاریخی افق پر نمودار ہونے والے ایک روشن ترین ستارہ ہیں ۔وہ شاعری بھی کرتے ہیں ،نثر بھی لکھتے ہیں ،افسانے اور شگفتہ مضامین بھی لکھتے ہیں ،تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی مقالات بھی لکھتے ہیں ۔ان میں ذوق تحقیق وجستجو اور گمشدہ تاریخی اوراق کو تلاش کرنے کا شوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔ ان کی تحریریں خوبصورت اور دل آویز ہیں ۔ان کا جذبہء تحقیق بلتستان کے ادبی مستقبل کے لئے نہایت خوش آئند ہے ۔ وہ نظم ونثر کے مرد میدان ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تعلیم بھی ہیں ،حسرت صاحب کی ہمہ پہلو صفت شخصیت علمی وادبی حلقوں کے لئے بالخصوص اور عام معاشرے کے لئے بالعموم بہت بڑا سرمایہ ہے ۔ وہ متعدد اہم قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بلتستان کی ثقافت ،زبان اور ادب پر مقالے پیش کر چکے ہیں ۔

تاریخ ادبیات بلتستان، بلتستان تہذیب وثقافت،شملہ سےبلتستان تک،انیس بلتستان، راجہ حسین خان محبّ اور پولوان کی کتابیں ہیں۔

الحاج فدامحمد ناشاد

حاجی فدامحمد ناشابلتستان کے معروف راجہ خاندان مقپون کے چشم و چراغ ہیں۔ان کے خاندان میں راجہ حسین علی خان محبّ، ذاکراور راجہ بیدل جیسے معروف شعراء گزرے ہیں۔میری معلومات کی روشنی میں راجہ بیدل بلتستان کے پہلے اردو کے باقاعدہ شاعر ہیں حضرت علی کی شان میں لکھی گئی ان کی ایک اردومنقبت مقبول عام ہے جو بلتستان (لداخ) بھر میں پڑھی جاتی ہے۔اس منقبت کا مطلع اور مقطع بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرداراولیا ہے مشکل کشاہمارا
محبوب کبریا ہے مشکل کشاہمارا
کیاغم ہے تجھ کو بیدل محشر کی تشنگی کا
وہ صاحب عطا ہے مشکل کشاہمارا

ناشادصاحب کے والد بھی بلتی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ناشادصاحب کواللہ تعالیٰ نے گوناگوں صلاحیتیں عطا کی ہیں۔میرے خیال میں پورے شمالی علاقہ جات میں وہ واحد ایسی شخصیت ہیں جن میں علوم وفنون، انتظامی، سیاسی، فلاحی اور معاشرتی صلاحیتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

ناشادصاحب ملکی اور مقامی اخبارات و جرائد اور کتابوں میں علمی و ادبی مضامین اور مقالات بھی لکھتے ہیں۔وہ صحافت کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔بہترین شاعری کی صلاحیتیں بھی ان کے اندر موجود ہیں لیکن گہری مصروفیات کی وجہ سے وہ باقاعدہ شاعری نہیں کرتے۔البتہ چندسال قبل جب حلقہ ارباب ذوق گلگت کے زیراہتمام کل شمالی علاقہ جات سطح کی ایک محفل مشاعرہ کی جب وہ صدارت کررہے تھےتومحفل کے رنگ کو دیکھتے ہوئے مشاعرے ہی کے دوران انہوں نے ایک قطعہ سنایا جوان کی شاعرانہ صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مجھ پہ الزام شاعری ہے بہت
پر کبھی شاعری میں کرنہ سکا
ذہن میں میرے، چندخاکے ہیں
ان میں لیکن میں رنگ بھرنہ سکا

ناشاد صاحب کے شعروادب اور علمی ذوق کا اندازہ ہم اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ انہیں بے شمار شعراء کے ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں جب کسی محقق یا شاعر کو کسی شاعر کے شعر کے بارے میں تصدیق کرنی ہو یا کسی شعر کے شاعر کو معلوم کرنا ہو تو وہ ناشاد صاحب سے رجوع کرتا ہے۔

پروفیسر حشمت علی کمال الہامی

پروفیسر حشمت علی کمال الہامی عربی، فارسی، اردو، اور بلتی زبانوں کے ادبیات پر مکمل دسترس رکھتے ہیں وہ فیڈرل گورنمنٹ ڈگری کالج سکردو میں اردو ادبیات کے اسسٹنٹ پروفیسر اور آموزش زبان فارسی سکردو میں ادبیات فارسی کے استاد ہیں۔کمال الہامی، فارسی، اردو اور بلتی زبانوں کی تمام اصناف سخن کے قادرالکلام شاعر ہیں۔

نثر کی جملہ اقسام بالخصوص تنقید، تحقیق، تخلیق، انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری اور علمی وادبی مقالات لکھنے میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔''امن کی تلاش'' ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔کمال الہامی تحقیق وجستجو کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ان میں تنقیدی شعور اور تخلیقی صلاحیتیں بھر پور انداز میں موجود ہیں۔وہ اعلیٰ تعلیم کے دلدادہ ہیں۔بل الخصوص اردو اور فارسی ادبیات کی مسلسل تحصیل وتدریس ان کا محبوب مشغلہ ہے۔وہ اس وقت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل/ پی ایچ ڈی اردو مکمل کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ایم فل کے لئے ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ہے'بلتستان میں اردو زبان وادب کا فروغ' بلتستان میں اردو زبان وادب پر تحقیق کرنے والے وہ پہلے محقق اور ادیب ہیں۔

سید محمد عباس کاظمی

سید محمد عباس کاظمی انتہائی ذہین اور زیرک محقق ہیں۔یوں تو وہ ہر میدان کے شہسوار ہیں لیکن ان کا اصل میدان تحقیق، آثار قدیمہ، بلتی رقص وموسیقی، لوک گیت، داستان کیسر، بلتی قدیم رسم الخط اور بلتستان کے نسلی گروہ جیسے پیچیدہ اور محنت طلب موضوعات ہیں۔کاظمی صاحب کی مشہور کتاب ''بلتی لوک گیت'' اور اس کا سلیس اردو ترجمہ ان کی انتھک محنت اور ذوق تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کاظمی صاحب 'بلتستان'' کے نام سے ایک تحقیقی وادبی شمارہ بھی جاری کر چکے ہیں وہ ملکی اخبارات وجرائد میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، معروف ادبی رسالہ ادبیات میں ان کے چند تحقیقی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔وہ ہمہ وقت نئی تحقیق وجستجو میں مگن رہتے ہیں۔

غلام حسن حسنی

غلام حسن حسنؔی اردو بلتی زبانوں کے شاعر ہیں۔ان کی بلتی غزلوں کا مجموعہ ''خسمی میلونگ'' (آئینۂ فکر) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔بلتی مراثی کا مجموعہ بھی ''چھیمی بلٹن'' (نذرانہ اشک) کے نام سے شائع ہوا ہے۔غلام حسن حسنؔی شاعری کے ساتھ ساتھ اقسام نثر میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ان کی ترتیب کردہ بلتی ضرب الامثال پر مشتمل کتاب'' تم لو'' بھی چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔مختلف اخبارات و جرائد اور علمی و ادبی رسالوں کے لئے مضامین بھی لکھتے ہیں۔وہ ایک مدت تک ادبی تنظیم حلقہ علم ادب کے صدر رہے ہیں۔ا

شیخ غلام حسین سحرؔ

شیخ غلام حسین سحر کو شاعر چہار زبان کہا جاتا ہے چونکہ سحر صاحب اردو، بلتی، فارسی اور عربی زبان بخوبی جانتے ہیں۔اور ان چار زبانوں میں انہوں نے بہترین انداز میں شاعری کی ہے۔ان کی جائے پیدائش شگر چھورکا ہے۔۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے اور تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی پھر اس کے بعد عراق چلے گے۔وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد شام اور بعد میں لبنان چلے گئے وہاں کچھ مدت کسی اسکول میں مدرسی کا کام انجام دینے کے بعد ۱۹۸۱ء میں وطن واپس ہوئے اور یہاں بھی درس و تدریس کے ساتھ وابستہ رہے۔

محمد حسن حسرتؔ ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

شیخ غلام حسین سحرؔ روایتی علماء کے مزاج کے برخلاف بلتی زبان و ادب کے بڑے شیدائی ہیں۔شیخ سحرؔ نے مشق سخن کی ابتداء اس وقت کی جب آپ شگر میں تیسری جماعت میں زیر تعلیم تھے۔کسے معلوم تھا کہ غلام حسین نامی یہ بچہ بڑا ہو کر شاعر چہار زبان کہلائے گا۔سحرؔ میں بلا مبالغہ لبنان کی فصیح عربی، ایران کی فارسی، لکھنوء کی شستہ اردو اور شگر کی بلیغ و عمیق بلتی کے علاوہ شاعری کے تمام رموز و سحر انگیزیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔شیخ غلام حسین کے ساتھ تخلص کے تین حروف ''س، ح، ر'' پر مشتمل ''سحر'' اپنے اندر ایک امتیازی معنویت اور سحر رکھتا ہے۔ان تین اشارتی حرفوں نے شیخ سحرؔ کی شخصیت میں ''س'' سے سخن نواز، ''ح'' سے حلیم الطبع، اور ''ر'' سے ریاضیت کی خاصیتیں پیدا کر دی ہیں۔اسی لیے ان کا رنگ سخن سب سے جدا ہے۔سحرؔ کی شاعری دراصل روشنی عطا کرنے والی شمع ہے۔اور سحرؔ کو بلتی ادب پر فخر ہے۔طبیعت میں انفرادیت کے باعث مروجہ روش سے ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔آپ ایک صاحب طرز شاعر ہے جن کے ہاں اپنا الگ لہجہ اور انوکھا پن ملتا ہے۔شیخ کی شاعری کا مرکزی موضوع زندگی سے نفرت اور پھر موت سے محبت ہے۔(حسرتؔ، محمد حسن؛ پیام سحر (مجموعہ کلام) شیخ غلام حسین سحرؔ، بلتستان بک ڈپو پبلیکیشنز نیا بازار، سکردو بلتستان، ۲۰۱۳، ص:۱۰)

ا۔نگارشات بلتستان میں، بلتستان کے اردو اہل قلم کے عنوان سے پروفیسر حشمت علی کمال الہامیؔ نے تحقیق اور تنقید کی زمرے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے اسے اخذ کیا گیا ہے۔
(نگارشات بلتستان؛ سودے بکس، پبلیشر بک سیلر سپلائیر، علمدار روڈ، سکردو، ۲۰۰۵ء ص:۵۹، ۷۳)

شیخ صاحب کا ایک بلتی کلام جو بلتی زبان کی اہمیت کے حوالے سے لکھا ہے:۔

سوسوی سکت پولا ہرژیامید (طرحی مشاعرہ)

اردولا ہرژے چوکپونی سوسوی سکت پولا ہرژیامید
یو پینگنو پھہ سہ مید پنا ا ر د و لا فڑ ا سا مید
ا ر د و پونی ہرژیامید، یری ا ر د و لا فو سا مید
بلتینگنو ہو ہو مید پنہ ا ر د و ہا ہا بید
بر ژھم لا کھڑ ید ہا نہ د یہا ہا نہ ا یہا مید
اردولا ہرژے چوکپونی سوسوی سکت پولا ہرژیامید
فِر سکت چی لا کوی رنگ یو لی رنگ سکتپو مہ کوا یود
سکت بیار پوسکیوری سکت لیا خی بنگ سکتپو مہ کوا یود
بلتی ا د ب تم کھلی فنگ سکتپو مہ کو ا یو د
تھقر ینگ لا چی کوی یکھہ نیونو ردو کسے نا کوا مید

اردولا ہرژے چوکپونی سوسوی سکت پولا ہرژیامید (الخ)۔۱ (ص:۱۸۴)

اردو اور دیگر زبانوں کے رجحان مقامی زبان (بلتی) کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر شاعر نے طنزیہ انداز میں بلتی زبان کو استعمال نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔ اور اپنی زبان (بلتی) کو بھول کر دوسری زبانوں کو خاطر میں لانے کی کوشش میں نہ بلتی زبان کو صحیح بول پاتے ہیں نہ دوسری زبانوں کو۔

اردو نظم، عنوان ہے ''زندگی''

کب تلک دیکھے گی یہ سرابِ زندگی
پی کے کس نے قے نہیں کی ہے شرابِ زندگی
ایک ایک کلمہ بھرا ہے تلخیوں سے لاکھ لاکھ
میں نے یہ دیکھا پڑھی ہے جب کتابِ زندگی

زندگی ہے موت لیکن موت آئے گی نہیں

جب تلک دیکھے نہ انسان پیچ وتابِ زندگی

خلد سے آئے بلاوا اس کو جو انساں رہے
اور وہ پورا کرے اپنا نصاب زندگی

قبل موت رب دوعالم کو دیا اس نے حساب
جس نے یاں پر لے لیا اپنا حسابِ زندگی

حد انسانی سے جو خارج ہوا اس کے لیے
موت بن سکتی نہیں ہرگز جوابِ زندگی

زندگی مجرم بنا کر جو کرے گا پیش وہ
موت کی صورت میں بھگتے کا عتاب زندگی

جو حقیقت خواب کو کہتا ہے وہ خوابیدہ دل
خودکشی سے دور کرتا ہے عذاب زندگی

تیرے بالوں کی سفیدی کیوں مصیبت بن گئی
بشریت میں عام ہیں شیخ و شباب زندگی

جب حیات جاودانی موت کے پردے میں ہے
پھر سحر تجھ کو ہے پیارا کیوں یہ خوابِ زندگی ۔۲ (ص:۲۰۵)

رفتہ رفتہ بلتی زبان کی شاعری متمول ہوتی گئی۔ یہاں کے شعراء کے مجموعے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ شائع شدہ مجموعوں میں مراثی ونوحہ جات اور منقبت پر مشتمل مخزن البکاء (مختلف شعراء کا انتخاب)، ''خزینۃ البکاء'' (۱۹۸۰ مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب)، ''غم کدہ'' (۱۹۶۰ء مختلف شعراء کا انتخاب)، ''ماتم کدہ'' (۱۹۷۵ء مختلف شعراء کا انتخاب)، ''منبع المصائب'' (۱۹۹۳ء مختلف شعراء کا انتخاب)، ''ریاض الحسینی'' (۱۹۹۱ء از آخوند حسین)، ''گلدستہ عباس'' (۱۹۸۰ء از سید

۱۔۲، مشمولہ، پیام سحر

شاہ عباس)،''گل عباس''(۱۹۹۱ءمختلف شعراء کا انتخاب)،''چراغ مصطفوی''(۱۹۹۷ءفدا حسین شمیم)،''گلزار حسن'' (۱۹۹۲ءآخوند حسن)،''زبدۃ المناقب''(۱۹۸۲ءمختلف شعراء کا انتخاب)، ''بادہء مودت''(از زائر غلام رضا)، ''نوائے طالب''(۱۹۹۴ءاز حاجی غلام حسن طالب)،''مجموعہ قصائد''(۱۹۷۸ءمختلف شعراء کا انتخاب)،''گل کدہ''(۱۹۹۱ءمختلف شعراء کا انتخاب)،''گلستان زہرا''(۲۰۰۰ءمختلف شعراء کا انتخاب)،''گلستان قصائد''(۱۹۹۸ءمختلف شعراء کا انتخاب)،''نقیب آزادی''کلیات حیدر''(۱۹۹۸ءاز راجہ حیدر خان حیدر)،''چھمبی بلٹن اشکوں کا نذرانہ''(۲۰۰۰ء از غلام حسن حسنی)،''یاز ماینگ تھونگ''(۱۹۷۲ءاز شمیم بلتستانی) اور''نفحات طیبہ''(از محمد ابراہیم زائر)انیس بلتستان(بزم محبّ)از محمد حسن حسرتؔ(۲۰۰۴)،داستان کربلاء(۲۰۰۵)از کاچو اسفندیار خان فریدوں کرگل،کلیات صادق(۲۰۰۵)از صادق علی صادق کرگل قابل ذکر ہیں۔بلتی زبان میں صنف غزل کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اب تک صرف غلام حسن حسنی کی غزلوں کا مجموعہ''خسمی میلونگ''(یعنی آئینہ فکر)۱۹۹۸ءمیں شائع ہوا ہے۔

بلتی ادب کے ادباء وشعرائے لداخ

بلتستان کے مقابلے میں لداخ میں بلتی زبان وادب کے تخلیق کار بہت کم پائے جاتے ہیں۔لداخ دور دراز واقع ہونے کے سبب بلتستان کے بعد ادب وثقافت سے روشناس ہوا۔یہی سبب ہے یہاں زبان وادب کے حوالے سے بلتستان کی سی زرخیزی نہیں ملتی۔لداخ کے چند ادیبوں اور شاعروں کی حالات زندگی اور ان کے تخلیقی کارناموں کا یہاں مختصراً جائزہ پیش لیا گیا ہے۔

شیخ غلام حیدر

شیخ غلام حیدر ۱۳۸۹ھ میں بلتستان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد اور چچا سے حاصل کی۔بعد میں بلتستان کے مشہور مدرسہ،آقاء شاہ عباس میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے۔

صادق ہرداسی لکھتے ہیں:۔شیخ غلام حیدر نے مسائل شرعیہ،فنون عربیہ،تفاسیر قرآن مجید اور دیگر کتب احادیث پر عبور حاصل کیا۔اس کے بعد علمی پیاس بجھانے کے لیے نجف اشرف تشریف لے گئے۔نجف اشرف میں آپ کی ملاقات شیخ حسین تبّتی مرحوم سے ہوئی جو اپنے تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے نجف اشرف میں کافی شہرت رکھتے تھے۔شیخ حسین تبّتی کی صحبت نے آپ میں تقویٰ اور پرہیز گاری کوٹ کوٹ کر بھر دی۔اپنی خداداد صلاحیت اور اعلیٰ ذہانت کی بدولت آپ صرف سات سال کے عرصہ میں اس مقام پر پہنچے کہ مجتہدین نے آپ کو قضاوت اور دیگر شرعی امور کا وکیل بنا کر بلتستان روانہ کیا۔نجف اشرف سے واپسی کے بعد آپ نے اس علاقے میں درس وتدریس کا کام شروع کیا۔آپ کو قرآن اور تعلیم القرآن سے جنون کی حد تک

لگاؤ تھا۔لہذا بچوں کوقرآن اور''تجوید القرآن'' کی تعلیم دینا، بالغوں کونماز سکھانا اور قرات کی درستی کے علاوہ مختلف آبادیوں میں مقابلہ حسن قراءت کی محافل کا انعقاد آپ کا خصوصی مشغلہ بن گیا تھا۔آپ جس مجلس محفل میں تشریف فرماتے تھے وہاں گفتگو کا اختتام قراءت اور''تجوید القران'' پر ہی ہوتا تھا۔آپ کے ہم عصر عالم دین شیخ علی نجفی برولموآپ کو''خزینتہ المسائل'' کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔آپ نے اپنے علمی ورثہ کوصرف مدارس اور تشنگان علم تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر رسمی طور پر عام آدمی تک پہنچانے کے لیے مختلف گاؤں کے دورے کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مرحوم (پوریگ) کرگل کے علاقے چھوسکور پہنچے۔کئی سال وہاں خدمات انجام دینے کے بعد (پوریگ) کرگل کے مشہور علاقہ سانکوتشریف لے گئے اور سانکومحلّہ کوثر میں مستقل سکونت اختیار کر کے علاقے کوقرآنی تعلیم کے نور سے منور کیا اور بلتی زبان میں منظوم''تجوید القرآن'' کومرحوم نے خود کتابت کر کے منظر عام پر لایا۔اس رسمی منظوم تجوید القرآن کوبلتی ادب کا اثاثہ تصور کیا جائے تو کم ہے۔تقریباً دوسوصفحات پر مشتمل خوبصورت کتابت قلمی کا پہلا بند:۔

این خدا شیسپی لز لو ینگنو بر چھوسی افضل پو فیاق
واجبات گنگ مینگ نا واجب پو چوغی اکمل پو فیاق

(بلتی ادب ،ص:۴۳۲)

اس شعر میں شاعر نے بلتی الفاظ کے ساتھ ساتھ اردو/فارسی کے چند الفاظ استعمال کئے ہیں۔مثلاً خدا، افضل، واجبات، اکمل۔

کاچوسکندر خان سکندؔر

ادباء کی فہرست میں کاچوسکندر خان سکندؔر کا نام بھی شامل ہے۔کاچوسکندر خان سکندر کو خطہ لداخ و بلتستان میں ایک مورخ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔محمد صادق ہرداسیؔ ان کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

خطہ لداخ سے تعلق رکھنے والے ایک نامور تاریخ دان کاچوسکندر خان سکندؔر تھے۔خاندانی لحاظ سے چکتن کے گاشو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔آپ چکتن کے ایک دور افتادہ گاؤں یقما کھر بو میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی بہت ذہین اور ہونہار تھے۔آپ نے نو سال کی عمر میں حصول تعلیم کے لیے کرگل کا رخ کیا اور قصبہ کرگل کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔دوران تعلیم آپ ابا گرونگ (ایک محلّہ کا نام) میں رہتے تھے۔اپنی محنت سے ہر جماعت میں اول درجہ حاصل کرتے رہے۔جب آپ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے تو بد قسمتی سے آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔کچھ مدت تک تعلیم چھوڑنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول پھر ایس، پی کالج اور امر سنگھ کالج میں زیر تعلیم رہے۔واپس گھر آ کے ملازمت اختیار کی اور محکمہ مال میں

مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوکر اپنی پوری توجہ تحقیق وتخلیق کی طرف مبذول کردی اور تا حیات اس مقدس کام کو اپنا نصب العین بنائے رکھا۔ان کی پہلی تصنیف، جو ایک شہرہ آفاق لداخی ادب پارے (نور بوزانگپو۔اتھوق لھامو) کا اردو ترجمہ تھی، اس پر اتر پردیش اردو اکادمی سے انھیں ایوارڈ ملا۔دوسری تصنیف ''قدیم لداخ'' ان کی زندگی بھر کی محنت اور جستجو کا حاصل ہے۔ان کی تیسری تصنیف ''لداخ ان دی مرر آف ہر فولک لور'' کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئی جو ایک سو لوک گیتوں کا انگریزی ترجمہ ہے۔انہوں نے اپنی سوانح حیات ''افکار پریشان'' کے نام سے لکھی جو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، کامیابیوں، ناکامیوں، یعنی ان کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ان کی مندرجہ بالا تمام تصانیف پورے لداخ یعنی لیہہ اور کرگل، سرحد پار گلگت بلتستان کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر کے اہل دانش کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ملک راج کے بقول:۔اہل لداخ کو ایک ایسا اہل قلم ملا ہے جس نے رضا کارانہ طور پر انتہائی محنت ومشقت اور قابلیت سے ان تصنیفات کو قلم بند کیا ہے، جن کے صلہ میں کاچو صاحب کو ملکی اور ریاستی سطح پر کل سات تمغے اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ان کی ایک تصنیف جو کیسر ساگا پر لکھی گئی تھی کا ترجمہ بیجنگ یونیورسٹی کی وساطت سے چینی زبان میں بھی کیا گیا ہے۔

(بلتی ادب، ص:۴۳۴)

شیخ غلام حسین وآخوند اصغر علی بشارتؔ

شیخ غلام حسین کرکت چھو

شیخ کی سوانح حیات کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں۔شیخ غلام حسین کرکت چھو ۱۹۱۶ء میں کرکت چھو میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی علم وادب سے لگاؤ تھا۔اسی لگاؤ کی وجہ سے حصول علم کے لیے اس دور کے عالم فاضل شیخ علی نجفیؔ برلمو کے مدرسہ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی اور شیخ علی نجفیؔ برولمو کے برگزیدہ طلباء میں شمار ہوئے۔تقسیم ہند سے پہلے شیخ غلام حسین نے اپنے محترم استاد شیخ علی نجفی برولمو کے ہمراہ تبلیغ کے سلسلے میں لیہہ لداخ تک کا پیدل سفر کیا۔راستے میں عام طور پر لامہ یورو کے بودھ مذہبی لوگ شیخ صاحب مذکور کی خدمات میں کوئی کسر نہیں رکھتے تھے۔شیخ علی نجفیؔ برولمو کے دربار میں جب بھی کوئی دینی سوالات پوچھتا تھا تو ان سوالوں کے حل کے لیے اکثر شیخ غلام حسین کرکت چھو کو مامور کرتے تھے۔تقسیم ہند کے بعد استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی الگ ہوگیا۔اور شیخ غلام حسین نے اپنے آبائی گاؤں کرکت چھو میں ایک مدرسہ کھولا جس میں پوریگ کے مقامی طلباء کے علاوہ لیہہ اور نیلا گرٹ کے کچھ طلباء بھی علم دین حاصل کرنے آئے۔

صادق ہرداسی لکھتے ہیں۔شیخ غلام حسین کو قدیم بلتی کلاسکی اسلامی شاعروں سے والہانہ محبت تھی اور وہ ان کے کلام سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ وہ قدیم بلتی شاعروں کا کلام سننے سنانے کے لیے اکثر نامور نعت خوانوں کو مدعو کرتے رہتے تھے جن میں نامور مرثیہ خوان وقصیدہ خوان حاجی غلام حسین مجد اس قابل ذکر ہیں ۔اس دور میں چند باذوق حضرات کی قلمی بیاض کے علاوہ یہ تمام ادبی شہہ پارے سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ان قدیم شعراء کے کلام کو جمع کر کے کتابی شکل دے کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی ٹھان لی اور کرگل کے گوشہ وکنار کے علاوہ کشمیر کے بلتی آبادی والے علاقے بانڈی پورہ اور بلتی ادبی گاؤں ترال کشمیر تک جا کے ان کلام کو جمع کیا اور باضابطہ طور ترتیب دے کر ۱۹۷۶ء میں سرینگر پہنچے۔ جہاں اس وقت کے ریاستی وزیر کا چومحمد علی خان پشکم کی وساطت سے اس دور کے سیکریٹری جموں وکشمیر کلچر اکاڈمی فدا محمد حسنین اور نامور ادیب کی پرخلوص مدد سے ''محرق القلوب''، مجموعہ مراثی اور ''جواہر الافکار'' مجموعہ حمد، نعت، قصائد، بحر طویل جیسی تصنیفات بہ زبان بلتی منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ (بلتی ادب،ص:۴۳۷)

آخوند اصغر علی بشارت

بلتی شاعری میں شہرت پانے والوں میں ایک اور نامور شاعر اخوند اصغر علی بشارت صاحب ہیں ۔موصوف کے بارے میں صادق علی صادقؔ لکھتے ہیں۔

بلتی زبان میں نعتیہ شاعری کے آغاز کا قطعی تعین تو شاید ایک مشکل امر ہوگا۔لیکن اس زبان میں باضابطہ نعتیہ شاعری کے سلسلے میں جو تواریخی شواہد سامنے آتے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اس صنف سخن کے آغاز کا پتہ بلتستان کے آخری تاجدار مقپون احمد شاہ کے زمانے یعنی اٹھارویں صدی کے اواخر سے ملتا ہے۔ابتدا میں اس صنف سخن کو شگر کے عما چہ خاندان کے چشم و چراغ راجہ حیدر خان (غازی) سے فروغ ملا۔اور یوں اس صنف کی زلف کی آرائش اور اس کے خدوخال کو زیب وزینت فراہم کرنے میں بلتستان کے شہزادے، سادات عظام اور صوفیائے کرام کی خدمات کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔اور ان کے علاوہ نعتیہ شاعری سے اپنے دیوان کے لیے فیض و برکت حاصل کرنے کے سلسلے میں ہر بلتی شاعر نے خواہ وہ دور متقدمین کا ہو یا متوسطین کا کم وبیش اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔بحمداللہ دور جدید میں بھی بلتی زبان میں نعتیہ شاعری پر فکر و فن کے چراغ جلانے والوں کی فہرست میں مخلصین کی بالکل کمی نہیں ہمارے ہاں آج بھی ایسے شعراء ہیں جو عشق الٰہی ونبوی کے وافر سرمائے کے ساتھ نعتیہ شاعری کے فکر وفن کی پرورش میں مصروف ہیں اور اس میدان عمل میں کرکیت چھو کرگل کے آخوند اصغر علی بشارتؔ بھی کوشاں و کمر بستہ رواں دواں ہے۔آخوند اصغر علی بشارتؔ علامہ شیخ غلام حسین (کرکیت چھو) کے فرزند ارجمند ہیں جنھوں نے اپنے مرحوم والد کے خوابوں کی ادھوری تعبیر کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا ہے اور آج بھی اپنے مرحوم والد کی حسرتوں اور تمناؤں کو پورا کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف وکوشاں ہیں۔علامہ شیخ غلام

حسین مرحوم (کرکیت چھو) ضلع کرگل کے ان نامور برگزیدہ اور بزرگ علماء میں سے تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ واشاعت میں گزاری۔آپ نے اس علاقے میں ناقابل فراموش معاشرتی اصلاحات نافذ کیں۔جس سے یہاں ایک متمدن سماج ومعاشرہ کو جنم لینے میں مدد ملی اور اس پسماندہ ترین دور میں یہ بات قابل فخر ہے کہ آپ نے درس وتدریس اور تبلیغ اسلامی کے ساتھ بلتی زبان میں فقہی اور مذہبی تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا۔

آپ انتہائی ادب نواز عالم تھے اور بلتی زبان وادب سے خصوصی اور گہرا شغف رکھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنے حیات میں ہی بلتی زبان کے دور متقدمین،متوسطین اور اپنے ہم عصر معروف وگمنام شعراء کے کلام کو (جنھیں بکھرے موتیوں کی طرح ناپید ہونے کا اندیشہ تھا) ڈھونڈ ڈھونڈ کر یکجا کر کے نعت ومنقبت،نوحے ومرثیہ جات اور مسائل دینیہ کے ذیل کی چار الگ الگ کتابیں۔اجواہرالافکار ۲۔راہ بہشت ۳۔محرق القلوب ۴۔تفہیم المسائل (ترجمہ توضیح المسائل) کے نام سے شائع کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے انہیں محفوظ کیا۔ابھی عقیدت مندوں کے سینے اور بیاضوں میں پوشیدہ محفوظ ادبی سرمایوں کو مزید کتابوں میں یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف وکوشاں ہی تھے کہ ان کی پیرانہ سالی اور زندگی نے وفا نہیں کی اور اس خواب کو ادھورا چھوڑ کر رحمت حق ہو گئے۔

جیسا کہ آگے عرض ہوا ہے آخوند اصغر علی بشارت نے اپنے مرحوم والد علامہ شیخ غلام حسین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف بلتستان و وپور یگ بلکہ برصغیر ہندو پاک کے ہر کونے میں موجود قدیم وجدید بلتی شعراء کے گم گشتہ شہ پاروں کو جمع کر کے نعت ومنقبت،بحر طویل اور مراثی ونوحہ جات کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور آج یہ کتابیں کرگل کے تقریباً ہر کتب فروش کے پاس دستیاب ہیں۔ا۔خزینہ الجوہر ۲۔گلدستہ نجات ۳۔ائینہ غم ۴۔روضتہ الجنان۔

(بشارتؔ،آخوند اصغر علی؛گلدستہء بشارت،ایس ایس انٹر پرایز رکوچہ چیلان دریا گنج،دہلی،اکتوبر،۲۰۰۳،ص:۴)

کاچو حبیب خان یبگو

کاچو حبیب خان یبگو کولداخ و بلتستان میں ایک مدرس،محقق اور تاریخ دان کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ان کی حیات اور کاناموں کے بارے میں محمد صادق ہراسیؔ لکھتے ہیں:۔

کاچو حبیب خان یبگو ۱۹۲۰ء میں کرگل کے ایک گاؤں جسے گونما کرگل سے جانا جاتا ہے وہاں پیدا ہوئے۔والد کا نام کاچو ابراہیم خان یبگو تھا۔آپ نے منشی فاضل تک تعلیم حاصل کی۔۱۹۳۸ء میں آپ بحیثیت سرکاری استاد تعینات ہوئے۔اس دوران غیر منقسم جموں وکشمیر کے زمانے میں موجودہ پاکستانی مقبوضہ اولدینگ اور چھور بٹ بلتستان اور کرگل کے مختلف علاقوں میں بھی بحیثیت سرکاری مدرس کام کرتے رہے۔آپ کے آبا واجداد بلتستان علاقہ خپلو کے نامور راجہ خاندان یبگو سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کے اجداد میں سے راجہ یعقوب شاہ خپلو سے آکر گونما کرگل میں آباد ہوئے۔

آپ بلتی زبان کے علاوہ اردو فارسی زبان پر کافی مہارت رکھتے تھے۔حبیب خان ایک اعلی پایہ کے تاریخ دان اور محقق تھے۔اس بات کے شواہد ریاستی کلچرل اکادمی کے جریدے ''نتی ادب بلتی'' میں شائع ہونے والے مضامین سے ملتے ہیں جن میں ''۱۹۴۷ء سے قبل کرگل اور بلتستان کے تعلقات ۱۹۸۲ء، پوریگ اور لداخ پر ڈوگروں کا پہلا حملہ ۱۹۸۴ء اور پرگ اور لداخ پر ڈوگروں کا دوسرا حملہ ۱۹۸۵ء قابل ذکر ہیں۔ (بلتی ادب،ص:۴۴۰)

شیخ محمد حسین ذاکری

شیخ محمد حسین ذاکری ، آخوند محمد ابراہیم کے فرزند ، پرتاب گنج موجودہ نام باغ خمینی میں ۱۹۴۰ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ عراق چلے گئے۔وہاں طبیعت ناساز رہنے کی وجہ سے صرف دوسال تک رہ پائے۔وطن واپسی کے بعد مختلف معاشرتی امور کو انجام دیتے رہے۔ساتھ ہی ساتھ ادب کے ساتھ لگاؤ بھی تھا۔اس کی وجہ سے مختصر طور پر نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔شیخ صاحب کی نظمیں پورے خطے میں مشہور ہوئیں۔خصوصاً ان کے بعض مدح ومنقبت۔

''بہار مودت'' عرف ''ہرگالو کسی زیبار'' حجۃ الاسلام شیخ محمد حسین ذاکری کے کلام کا ایک مجموعہ ہے اس میں بہت سے منقبت ومدح خطہ لداخ خصوصاً ضلع کرگل کے باشندوں میں سے بعض لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔یہ کتاب دوسری بار ۲۰۱۸ میں چھپی ہے۔''فرونی دعا'' کے نام سے ایک نظم چھپی ہے پوری نظم اردو میں ہی ہے۔اس کے بعد دوسرے عنوان سے جو نظم ہے وہ تقریباً پرگی رلبتی میں ہے۔بطور مثال فرونی دعا ملاحظہ ہو۔

خدایا ، خدایا ، خدایا ، خدایا قبول التجا ہو ہماری خدایا
تجھے واسطہ ہے محمد نبی کا میرے سر پہ سایہ رہے پنجتن کا
دلوں کا اجالا ملے معرفت کا جہالت کا پردہ ہٹادے خدایا
ستایا ہوں دنیا کے ظلم وستم کا طلب گار ہوں تیرے لطف وکرم کا
اصولوں کا پابند انسان بنادے تو اپنا حقیقی مسلمان بنادے
حصولِ مقاصد کا خوگر بنادے ہمیں علم ودانش کا مظہر بنادے
تمنا میری ہے کہ قنبر بنوں گا میں سلماں بنوں گا ،ابوذر بنوں گا
مجاہد بنوں گا ، میں غازی بنوں گا حقیقت میں تیرا نمازی بنوں گا
سدا پیروئے شیر یزداں بنوں گا مددگار اسلام وقرآں بنوں گا

چمن نونہالوں کا کھلتا رہے گا   صلہ حق سے ذاکر یہ ملتا رہے گا

مدح خاتم انبیاؐ

یا نبی یا نگ خدا اس سلفی ریخچن   نیسپا چن برانگ لایود چوقپہ خشچن

خشپو چوق اے نبیون چوقپہ انچن   یا نبی ینگ خدا اس سلفی ریخچن

ستونگ صلواۃ نا درود پو یریکہ   یا نبی ینگ خدا اس سلفی رنچن

عالم نوری ینگ انپہ محمود   ہرگالفی شو قبو نینگنو مینگپو احمد ا

اس نظم میں خدا، یا نبی، صلواۃ، درود، عالم، نور، احمد جیسے فارسی اردو کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ شیخ علی نقی منجی، شیخ غلام حسن معجز، شیخ احمد محمدی، آخوند محمد کاظم سنگرہ، حاجی غلام عباس برو، آخوند احمد حسین ہرداس، سید حسین الموسوی امبہ، کاچو اسفندیار خان، غلام حیدر لاآلی، آخوند کاظم سانکو، حاجی احمد علی ترابی پشکیم، بوا قربان علی قربانؔ تورتک وغیرہ کرگل کے نامور مصنفین میں سے ہیں۔ ان بزرگ شعراء اور ادباء کے علاوہ نوجوان نسل بھی بلتی / پرگی ادب میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔

کچھ بلتی اشعار جو مختلف اصناف شاعری پر مشتمل ہیں جن پر اردو فارسی کے اثرات ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں بطور مثال پیش خدمت ہیں۔

خراج تحسین بخدمت جناب کور کمانڈر، ارجن رے

جدائی کے ان احساس لمحات میں اپنے محبوب، انسان دوست اور غریب پرور کمانڈر کے تئیں کرگل کے غریب لوگوں کے جو جذبات اور احساسات ہیں ان کو میں نے ایک چھوٹی سی نظم میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائے:۔

(نظم) درنگ سکول ئینگ شربہ منگمو مے دمسے یود۔۔۔ژھرمہ ژھونثرے سغئ ینگ لہ ہلتین چی یود

تورے کور کمانڈر تورے کور کمانڈر

ترجمہ:۔ آج اسلامیہ اسکول میں لوگوں کا ایک جم غفیر ہے۔ بچے، بوڑھے اور جوان سبھی کی نظریں اپنے محبوب

ا۔ ذاکرؔ، شیخ محمد حسین؛ بہارِ مودت، عرف ہرگالوکسی زبیار، الھدیٰ اسلامی مرکز، جامع مسجد، کرگل، اگست، ۲۰۱۸۔ ص:۶

کمانڈر پر جمی ہوئی ہیں ۔اے کور کمانڈر،اے کور کمانڈر۔

لق زبوت منگمو مہ بیوس یا جوز یرے فودے تو نگ   خداس خسمنہ دے تاتنگ دوبارہ تھو کپہ یود

تورے کور کمانڈر تورے کور کمانڈر

اس شعر میں اردو کا لفظ دوبارہ استعمال ہوا ہے۔

ترجمہ:۔اپنے پیارے مہمان کو زیادہ تکلیف مت پہنچاؤ۔نیک خواہشات کے ساتھ ان کو رخصت کرو۔اگر خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔اے کور کمانڈر،اے کور کمانڈر۔

باقرؔ شد یا ینگ نہ بیور بی چنگ فیق ھبس چی مید   خسمزون عِفرنگ جو سے یری خدمت لہ ناس کھیونگسے یود

تورے کور کمانڈر تورے کور کمانڈر

مصرعہ ثانی میں لفظ خدمت استعمال ہوا ہے

باقرؔ کے پاس چند تخیلات کے سوا آپ کی شایان شان کوئی تحفہ نہیں ہے اے کور کمانڈر،اے کور کمانڈر۔

(باقرؔ،الحاج محمد باقر؛موضع پشکیم،کرگل،قلمی نسخہ)

(قصیدہ)   دوخسین چہ شخص دنیا دیکہ دوخفہ مشیس پاسنگپولا

دنیائی دوخف ہ دائمی آرام وراحت انمنا

گالدنفی اعمال چکتو لا یو شرط صحت انمنا۔

ان مصرعوں میں اردو/فارسی کے الفاظ دنیا،دائمی،آرام وراحت،اعمال اور شرط صحت استعمال ہوئے ہیں۔

(بشارتؔ،آخوند اصغر علی؛خزینۃ الجواہر،بشارت پبلشر،کرگل،۲۰۱۴)

نعت رسول صلعم

شربنا شربی نیماؤ نا ژوقس بیا سے مکیں نوگ ین

ستور جہالت پوعرب پی یا محمد مصطفیٰ

اس مصرعے میں اردو/فارسی کے الفاظ جہالت،عرب اور محمد مصطفیٰ استعمال ہوئے ہیں۔

(جالبؔ،جواد امینی؛مجموعہ کلام ’مدحت‘ بزبان پرگی (بلتی) امینی پبلیشرز،کرگل لداخ،جنوری،۲۰۱۵)

(نظم) مہا تما گاندھی

مسلمان ہندو نہ سکھ نہ عیسائی تنگسے ہرمق ژھرچی

یلینگ نہ سامراجی رمپہ چدفو مہا تما گاندھی

یہاں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی۔ سامراجی وغیرہ اردو کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(صادقؔ، علی صادق؛ صدائے صادق (جلد دوم تا چہارم) خصمی بیا بیونگ، مجموعہ کلام۔ بزبان بلتی۔ ایس ایس انٹر پرائزز دریا گنج دہلی۔ ۲۰۰۴۔)

(غزل) لے فریدونؔ۔ چپ چاتے۔ دوک۔ غد۔ بیاسے۔ ژھیو۔ چوق

زیرنا۔ میونس۔ زیز۔ زیروک۔ ہے۔ بے وفا۔ چھون لا

غزل کے اس شعر میں اردو کا لفظ چپ اور بے وفا استعمال ہوا ہے۔

(فریدونؔ، کاچو اسفندیار خان؛ بلتی پورگی مجموعہ، کلیمن، کاچو پبلی کیشنز ڈاک بنگلو روٹ، کرگل، لداخ۔ ص: ۴۶)

☆☆☆

باب پنجم

﴿حصہ اول﴾

بلتی زبان کے معروف نثر نگاروں کی تخلیقات اور ان پر اردو کے اثرات

﴿حصہ دوم﴾

بلتی کہاوتوں پر اردو کے اثرات

(حصہ اول)

بلتی زبان کے معروف نثر نگاروں کی تخلیقات اوران پر اردو کے اثرات

ابتدائی زندگی میں کاغذ کا کوئی وجود نہ تھا اور لوگ چٹانوں یا پتھروں پر لکھتے تھے تو ان تحریروں کو یاد رکھنا بہت مشکل تھا چنانچہ انسان جن باتوں کو یاد رکھنا چاہتا تھا، انھیں منظوم شکل دی جاتی تھی کیوں کہ اسے یاد رکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ نثر کے مقابلے میں انسان کا ذہن نظم کو آسانی سے یاد کر لیتا ہے۔ جب انسان نے باقاعدہ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور اسے اس معاملے میں سہولتیں حاصل ہوئیں تو اس نے نثر کی مختلف شکلوں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اسے اپنی بات صفائی اور آسانی سے دوسروں تک پہنچانے میں نظم کے مقابلے میں نثر زیادہ کارآمد نظر آئی۔

(اطہر پرویز؛ ادب کا مطالعہ، اردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء ص:۶۹)

بلتی زبان میں شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری کا ادبی سرمایہ کم ہے۔ تاہم حالیہ برسوں میں بلتستان میں نثری ادب میں اچھا کام ہو رہا ہے۔ ماضی میں بلتی عوام اور زبان پر جنگ نامہ حضرت علیؑ اور جنگ نامہ امیر حمزہ جیسے موضوعات کا اثر دیکھا گیا ہے جو اردو کی دین ہے۔ نیز قصہ طوطا مینا، رستم وسہراب اور الف لیلا جیسی داستانیں مقبول تھیں۔ فی زمانہ اردو فکشن، تنقید، انشائیہ، خاکہ نگاری، سفرنامہ وغیرہ اردو دانوں اور بلتی ادیبوں کو زیادہ پسند ہیں۔ جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی نگارشات پر اثر انداز ہیں۔

بلتی نثر کے سیاق میں اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں ان میں شگر کے عباس علی شاہ کی کتاب 'ماتمی شوقبو' ہے جو غیر مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں عیسائی مبلغین نے متی کی انجیل کا بلتی میں ترجمہ کیا۔ ان کا دوسرا کارنامہ 'کھوم لوکھسی لم' یعنی 'راہ نجات' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ دونوں کام بھی عباس علی شاہ عباس کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بروپرگ کے ماسٹر غلام عباس نے 'زادالمذنبین' کے نام سے اور ہرداس پرگ کے آخوند یوسف نے 'راہ نجات' کے نام سے بلتی میں مذہبی اصول واعتقادات کے موضوع پر دو کتابیں مرتب کیں۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں سکردو کے ایک مذہبی عالم شیخ جعفر مرحوم نے قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کیا۔ یہ بلتی زبان وادب کی حرماں نصیبی ہے کہ یہ ترجمہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں اصلاح معاشرہ کے عنوان سے بلتی نثر میں فدا حسین شمیم کی لکھی کتاب بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۹۹۲ء میں غلام حسن لوبسانگ نے 'اوت' کے نام سے بلتی میں نادر ونایاب اقوال زریں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۹۵ء میں یوسف حسین آبادی کے ذریعہ قرآن مجید کا بلتی زبان میں کیا گیا ترجمہ منظر عام پر آیا۔

بلتستان کے مشہور و معروف ادیب جناب یوسف حسین آبادی بلتی نثری ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل، ریڈیو پاکستان راولپنڈی اور ریڈیو پاکستان سکردو کی بلتی نشریات نے بلتی زبان کے نثری ذخیرے میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ بالخصوص چند دلچسپ ریڈیائی ڈرامے تحریر کئے گئے۔ خپلو کے محمد علی خان واحد، گول کے آغا شاکر، کھرگرونگ سکردو کے محمد عباس، کریس کے راجہ حامد حسین کے بلتی ڈرامے اور اردو میں غلام عباس سودے، محمد حسن حسرتؔ اور غلام حسن حسنی کے ڈرامے مقبول خاص و عام ہیں''۔۱

لداخ اور بلتستاں میں اسلام کی آمد کے بعد عربی اور فارسی کے الفاظ بڑے پیمانے پر بلتی زبان میں داخل ہوئے۔ ان میں سے اکثر بلتی زبان کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس طرح ان الفاظ کا خوب صورتی سے استعمال کیا ہے کہ یہ الفاظ طبیعت پر بالکل بھی گراں نہیں گذرتے۔ ۱۸۴۰ء کے بعد بلتیوں کی برصغیر میں دور دور تک آمد و رفت شروع ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں بھی اردو کے الفاظ بکثرت اس زبان میں داخل ہوئے۔

نثری ادب کے بارے میں کاچو سکندر خان سکندرؔ لکھتے ہیں:

''کوئی خاص نثری تخلیق اس علاقے کی دریافت نہیں ہوئی ہے۔ مولوی حشمت اللہ خان کی تاریخ جموں و مفتوحہ علاقہ جات مہاراجہ گلاب سنگھ کے راجگان شغر کے معرکوں کے بیان میں ایک منظوم تاریخی سفرنامے کا ذکر ہے۔ لیکن وہ فارسی میں ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نثری کارنامہ دریافت نہیں ہوا ہے۔ البتہ بعض شاہی خاندانوں میں راجگان قدیم کے شجرہ ہائے نسب اور فرامین اور سادات خاندانوں میں قدیم سادات خاندان کے شجر ہائے نسب اور ان کے حق میں راجگان وقت کے جاری کردہ فرامین و پروانے وغیرہ سے تاریخی مواد حاصل ہوسکتا ہے۔ (غالباً اس ضمن میں بکثرت مواد دستیاب ہیں)۔ تقریباً یہی صورت حال پوریگ کی بھی ہے۔ زانسکار میں پھوگتل گنپہ میں زانسکار کے قدیم شاہی خاندانوں اور گنپوں کی تاریخ موجود بتائی جاتی ہے، جس سے غالباً بہت سے مورخین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس قسم کے دستاویزات لداخ خاص میں بکثرت موجود ہیں۔ جن سے کئی ایک مورخوں نے تاریخی مواد اخذ کیا ہے ایس، ایس گیرگن مرحوم نے لداخی زبان میں لداخ کی تاریخ ''لداقس رگیال راپس چمدستر'' لکھی ہے۔ خواجہ عبدالغنی شیخ اردو زبان میں لداخی تہذیب کی عکاسی کررہے ہیں۔۲

۱۔ آبادی، محمد یوسف حسین، تاریخ بلتستان، بلتستان بک ڈپو نیا بازار، سکردو، ۲۰۰۳، ص: ۳۲۲، ۳۲۳

۲۔ سکندرؔ، کاچو اسکندر خان؛ قدیم لداخ، کپور برادرس بک سیلر، سرینگر، ۱۹۷۸ ص: ۶۰۸

محمد حسن حسرتؔ نے 'تاریخ ادبیات بلتستان' میں بلتی ادب کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

بلتی ادب

لوک ادب　　تحریری ادب

منظوم لوک ادب　　نثری لوک ادب

رکیانگ خلو، زدرونگ خلو، دیوان (برخلو)، ہرژے خلو، یورمی خلو، ردانحسی خلو

لوک داستان، لوک کہانی، ضرب الامثال ومحاورے

حمد، نعت، قصائد، مراثی ونوحہ جات، بحرطویل، گوشوارہ، غزل، شہرآشوب، منظوم تراجم، ملی نغمہ، زرعی نغمے، ریڈیائی ڈرامے۔

لوک ادب۔

یوں تو لفظ 'لوک' سے مراد انسان، آدمی، بشر، دنیا، عالم ہوتے ہیں۔ اور ادب کے معنی شناسائی اور پہچان کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر کہ اس کی تخلیق اجتماعی کاوش سے طے پاتی ہے۔ دنیائے ادب کی طرح بلتی ادب میں بھی لوک ادب کی روایت ملتی ہے۔

محمد حسن حسرتؔ لوک ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کسی قوم کے انداز فکر وعمل، ذہنی ارتقاء اور تہذیب وتمدن کا مرقع اس کا ادب ہوتا ہے۔ اور ادب میں لوک ادب کی حیثیت گل سرسبد کی طرح ہوتی ہے۔ یہی ادب اس علاقے کے لوگوں کی اخلاقی تہذیب اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لوک کے معنی عوام اور ادب کے معنی علم کے ہیں۔ اس طرح لوک ادب کے معنی ہونگے عوام شناسی۔ کسی علاقے یا ملک کے رہنے والوں کے مذہبی عقیدے، عادتیں، رسم ورواج اور ان کی حسرتوں وآرزؤں کو جاننے کے لئے وہاں کے لوگوں کا ادب ہی بہتر رہنمائی کرسکتا ہے۔ لوک ادب کسی قوم کی وحدت میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ رنگ ونسل اور مذہب وعقیدہ کا اتنا

پابند نہیں ہوتا۔ یہ عوامی ادب کسی ایک آدمی یا جماعت کی سوچ اور محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ مختلف لوگوں اور صدیوں کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اور اس کا وارث معاشرے کا ہر آدمی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ہر روح سے ہے۔ غم یا خوشی کے موقع پر عوام کے ہونٹوں پر بے ساختہ جو الفاظ نکلتے ہیں وہی لوک ادب کہلاتا ہے۔ بلتی زبان لوک ادب کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ لیکن یہ قیمتی ہیرے علاقے میں لکھاریوں کی قلت کی وجہ سے صرف لوگوں کے سینوں تک محدود چلے آرہے ہیں۔ا

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بلتستان میں علماء، شعراء اور ادباء کی کھیپ ملتی ہے۔ جنھوں نے زبان وادب کے حوالے سے کارہائے گراں قدر انجام دئے۔ انھوں نے بلتی زبان کے نثری ادب کو متمول بنایا۔ اسی دوران فارسی، عربی اور اردو حروف تہجی کی مدد سے ایک الگ طرز تحریر وجود میں آیا۔ اردو فارسی رسم الخط میں ہزاروں غیر مطبوعہ اور درجنوں مطبوعہ کتابیں وجود میں آئیں۔ اس طرز تحریر میں سب سے پہلے شگر کے مقبول ومشہور شاعر بوا عباس نے انجیل مقدس کا بلتی میں نثری ترجمہ کیا۔ اسے عیسائی تبلیغی مشن کے ذریعے شائع کیا گیا۔ سن ۱۹۳۴ء میں سنٹرل ایشین کی طرف سے آئے انگریز عیسائی مبلغ اے۔ ایف۔ سی ریڈ نے بلتی گرامر کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب شائع کی۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں گرامر کے علاوہ کم وبیش دو ہزار الفاظ پر مشتمل انگریزی۔ بلتی لغت بھی شامل ہے۔

بلتستان کے مقامی اسکالروں نے ۱۹۸۰ء کے بعد نثری ادب طرف توجہ دی۔ اس ضمن میں سب سے پہلے محمد یوسف حسین آبادی کی کتاب ''بلتستان پر ایک نظر'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس میں تاریخ کے علاوہ بلتی زبان پر ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد غلام حسن حسنیؔ نے ''بلتی تم لو'' نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں ضرب الامثال اور محاورات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سکردو کے ایک دینی عالم شیخ جعفر نے قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کیا تھا جو کسی وجہ سے اس زمانے میں شائع نہیں ہوسکا تھا۔ البتہ محمد یوسف حسین آبادی کا بلتی میں قرآن مجید کا ترجمہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ راجہ شگر محمد علی شاہ صباؔ بلتستانی نے بلتی۔ اردو لغت مرتب کی، جسے مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ ۱۹۹۰ء میں محمد یوسف حسین آبادی نے بلتی زبان پر ۳۶ صفحات کا ایک مقالہ لکھ کر کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ حسین آبادی نے ۲۰۰۴ء میں 'تاریخ بلتستان' کے نام سے جامع کتاب بھی شائع کی ہے۔

ا۔ حسرتؔ، محمد حسن؛ بلتستان تہذیب وثقافت، بلتستان بکڈپو اینڈ پبلیکیشنز نیا بازار سکردو، ۲۰۰۷ء ص: ۱۰۸

۱۹۹۱ء میں غلام حسن لوبسانگ کی بلتی گرامر پر مبنی کتاب ''پوسکت'' فارسی رسم الخط میں شائع ہوئی۔جس کی تمام اصطلاحات استخراجی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔انہوں نے اسے انگریزی زبان میں بھی منتقل کیا جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔''تاریخ بون فلسفہ'' بھی غلام حسن لوبسانگ کی تخلیق ہے۔۱۹۹۲ء میں معروف ادیب محمد حسن حسرت کی کتاب ''تاریخ ادبیات بلتستان'' شائع ہوئی جو بلتی زبان و ادب اور بلتی شعراء کے بارے میں ایک جامع تصنیف ہے۔یہ کتاب حلقۂ علم وادب میں کافی مقبول ہے۔

لوک ادب کو حسرتؔ صاحب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔منظوم لوک ادب اور نثری لوک ادب۔یہاں صرف نثری لوگ ادب کے حوالے سے بحث کریں گے۔منظوم لوک ادب کے حوالے سے گزشتہ باب کے حصہ نظم میں گفتگو ہو چکی ہے۔

نثری لوک ادب

بلتی زبان میں جس طرح منظوم لوک ادب ہے اسی طرح نثری لوک ادب بھی وافر مقدار دستیاب ہے۔لیکن یہ اب تک ضبط تحریر میں نہیں آئے ہیں۔بلتی زبان کے نثری ادب میں لوک داستان،لوک کہانیاں اور ضرب الامثال شامل ہیں۔

لوک داستان

دنیا کی ہر زبان اور بولی میں لوک داستانوں کی روایت موجود ہے۔بلتی زبان میں بھی لوک داستان کی قدیم روایت ملتی ہے۔یہ وہ اجتماعی اثاثہ ہے جو نسل در نسل کا سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔بلتی لوک داستان میں مافوق الفطری عناصر کی بہتات ہے۔اس سلسلے میں ایک متحیر کن شخصیت ہلافو کیسر کا کردار اور اس کی داستان سب سے زیادہ مشہور ہے۔جس کی کہانی نظم اور نثر دونوں میں طوالت کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔اسے نہ صرف لداخ وبلتستان بلکہ دنیا بھر میں شہرت حاصل ہے۔اس کے علاوہ رگیالوسترالبو اور رگیالو چولو بزنگ کی داستانیں بھی مشہور ہیں۔یہ تاریخی اور کلاسیکی انداز کی داستانیں بلتی زبان کی قدیم تہذیب وتمدن اور ثقافت کا مرقع بھی ہیں اور ایک مفصل تاریخی نسخہ بھی۔ داستان کیسر میں اس دور کے مذہب ''بون چھوس'' کے عقائد،رسومات،روایات،اصول ونظریات اور تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔اس کے علاوہ داستان کیسر میں تبت کے دیو مالائی بادشاہ ''ہلافو کیسر'' کی حالات زندگی اور اس کے جنگی کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔روایات کے مطابق اسے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل تخلیق کیا گیا تھا۔جسے تبّتی رسم الخط میں تحریر بھی کیا گیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس کے نسخے تبت اور لداخ کی بودھ عبادت گاہوں میں موجود ہیں۔لیکن بلتستان میں

جو نسخے دستیاب ہیں وہ اشاعت اسلام کے ابتدائی دور میں ہی تخلیق کئے گئے معلوم ہوتے ہیں۔

لوک کہانیاں

لوک کہانیاں انفرادی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ اجتماعی شعور کی زائیدہ ہوتی ہیں۔ان میں پورے معاشرہ اور سماج کی جھلک ملتی ہے۔اس میں ہمیں لوگوں کے قدیم عقائد،طرز معاشرت،رسم ورواج اور انداز فکر غرض وسیع زندگی کی تصویر ملتی ہے۔عام طور پر لوک کہانیاں سیکولر نوعیت کی ہوتی ہیں۔ان میں کسی طرح کی مذہبی شدت پسندی نہیں ہوتی ۔اور اسے لوک ادب کا ایک اہم حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔کیونکہ بلتی لوک ادب میں یہاں کی قدیم لوک کہانیوں کا زیادہ عمل دخل ہے۔اگر چہ ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔لیکن اب تک کسی نے لوک کہانیوں کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔عہد حاضر میں بلتستان میں معدودے چند افراد درج ذیل کہانیوں کے بارے میں علم رکھتے ہیں۔جو بلتی ادیبوں کی تخلیق کردہ ہیں۔اوران کہانیوں کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔

۱۔شینگ کھن چندن ۲۔اپی ژھوفڑا ۳۔باسیرمو ۴۔غبول گوستن ۵۔شین۔۔۔ ۶۔نیاسکم
۷۔سترینگ چکنہ مینگ چک ۸۔سنابو ۹۔اپی نا اپو ۱۰۔ھرکنگ مید ککانا۔۔۔ ۱۱۔ژھونگپانا طوطا
۱۲۔کتی نامتی ۱۳۔دانانا بیانو ۱۴۔فڑافڑ و ۔

بلتی ادب میں افسانہ کی روش تو پہلے نہیں تھی لیکن بعد میں اردو افسانہ نگاری کے طرز پر بلتی زبان میں بھی افسانہ لکھنے کا رواج عام ہوا۔

پروفیسر کمال الہامؔی لکھتے ہیں:۔

بلتستان کی تاریخ میں خالص بلتی زبان میں گیارہ خوبصورت افسانوں پر مشتمل پہلا باقاعدہ نثری ادب پھہ ہرتخ یعنی آبائی ورثہ محمد افضل روشؔن کی خوبصورت تخلیقی کاوشوں کا ثمر ہے۔

یہ بلتی زبان میں افسانوں کا پہلا شائع شدہ مجموعہ ہے اور افضل روشؔن کو بلتی زبان میں پہلے افسانہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ادب کے قارئین اور بلتی زبان شناس روشؔن کے افسانوں کا مجموعہ پھہ ہرتخ کا بغور مطالعہ کر کے اس حقیقت کا ضرور اعتراف کریں گے کہ انہیں بلتی زبان پر کس قدر عبور حاصل ہے۔بلتی لب و لہجے کی روح کی گہرائیوں اور یہاں کی تہذیب وثقافت کی پہنائیوں میں روشؔن کس طرح غوطہ زن ہیں۔یقیناً ادب شناس اس کتاب کو پڑھ کر حیرت کی حد تک اس کا ضرور احساس کریں گے۔

قمراہ کی سرزمین علم وادب میں بہت زرخیز ہے،اس علاقے کی زبان،لب و لہجے اور ادائیگی نیز تلفظ کو بلتستان بھر

میں سند کی حیثیت حاصل ہے۔خوش قسمتی سے روش کا تعلق قمراہ ہی سے ہے۔

لہذا ان کی زبان و بیان کی سند کا اندازہ ہمیں یہیں سے ہو جاتا ہے۔رورشؔ نے ان گیارہ افسانوں میں یہاں کی قدیم تہذیب،ثقافت،رہن سہن،رسومات وروایات،موسموں کے ساتھ وابستہ تقریبات،سماجی اور معاشی مجبوریوں،بلتی زبان کی قدامت،وسعت،ادبیت اور روحانیت کی خوب نقشہ کشی کی ہے۔گویا انہوں نے جدید بلتستان کو قدیم بلتستان کی تاریخ سے روشناس کیا ہے۔روش نے اگر ایک طرف بلتستان کی مٹتی ہوئی ثقافت کو ان افسانوں میں محفوظ کیا ہے تو دوسری طرف مادی دور کے تیز رفتار اثرات کی طوفانی لہروں اور خطرناک گرداب میں ہچکولے کھاتی ہوئی بلتی زبان کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا دیا ہے۔

نوجوان قلم کار افضل روش ایک صاحب کتاب شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کے علاوہ بلتی زبان میں افسانہ نگاری کی ابتداء کر کے بلتی ادب میں ایک نئی صنف کی بنیاد رکھی ہے۔افسانوں میں انہوں نے اپنی توجہ کو اس بات پر مرکوز کیا ہے کہ انھیں جزئیات کے ساتھ صفحہ قرطاس پر محفوظ کیا جائے۔بلتی زبان اور ثقافت کے تحفظ کے سلسلے میں ان کی یہ کوشش یقیناً قابل صد تحسین ہے۔اور تاریخ ادب بلتستان کا بے مثال کارنامہ بھی۔

محمد یوسف حسین آبادیؔ 'پھہ ھرتخ' کی تقریظ میں لکھتے ہیں:۔

بلتستان کے شعراء اس وقت بھی بلتی شاعری کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور بہت سے شعراء کے کلیات اور دیوان کا چھپ کر منظر عام پر آنے کا عمل جاری ہے۔لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ نثری ادب کے حوالے سے بلتی زبان نظر انداز ہی رہی ہے۔صرف بعض مذہبی کتب کے ترجمے،کچھ تبلیغی مواد اور ریڈیائی ڈرامے بلتی نثری ادب کا کل سرمایہ ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔نوجوان قلم کار افضل روشؔ صاحب کتاب شاعر ہیں جنہوں نے اس کم عمری میں اپنے نرالے موضوعات اور اچھوتے انداز بیان سے شاعری کے میدان میں اپنا تشخص قائم کر ہی لیا ہے۔اب انہوں نے بلتی زبان میں افسانہ نگاری کی ابتداء کر کے بلتی ادب میں ایک نئی صنف کی بنیاد رکھی ہے۔ا

پھہ ھرتخ بلتی افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔محمد افضل روشؔ نے یہ کتاب لکھی ہے۔اس کتاب میں گیارہ افسانے ہیں۔ا۔رنٹھق ۲۔سون بور ۳۔ٹیانگ کھنگ ۴۔تب تھو ۵۔نم روز ۶۔بیانو ۷۔مے فنگ ۸۔کھی فڑو ۹۔خسیر خلینگمہ ۱۰۔مک کھڑب ۱۱۔پھہ سکت،مصنف نے پورے طور پر بلتی الفاظ کو ہی اس کتاب میں استعمال کیا ہے۔اردو کے الفاظ پورے مجموعے میں تقریباً نایاب ہیں۔

محمد حسن حسرتؔ کے بقول:۔

محمد افضل روشؔ کی یہ کتاب بلتی زبان میں افسانہ لکھنے کی اولین کامیاب کاوش ہے۔ان افسانوں میں روشؔ نے بلند تخیلات کے ساتھ افسانوی کہانیاں تخلیق کرنے کے علاوہ بلتی زبان کے بھولے بسرے الفاظ کو خوبصورت لڑی میں پرو کر اس نیم خستہ جان زبان کو نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے۔

(ا۔روشؔ،محمد افضل؛پھہ ھرتخ،سودے بکس لنک روڈ،سکردو،دسمبر ۲۰۰۵ ص:۴)

افسانہ نگاری کی دنیا بلتی ادب میں آباد تو ہے لیکن زرخیز نہیں ہے۔خطہ لداخ کے ضلع کرگل سے تعلق رکھنے والے ایک نامور مصنف آخوند اصغر علی بشارتؔ جو شاعر بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔انہوں نے تین افسانے اور کئی بلتی ڈرامے لکھے ہیں۔افسانوں کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔شیخ ھسنگ لی،سلہ گونڈ اور چنگرہ۔اس کے علاوہ محرم الحرام کے حوالے سے دو فیچرس لکھے ہیں۔مصنف نے زبان پر کوئی قدغن نہیں لگائی ہیں۔ان کے افسانوں میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ جیسے''یا وخلا اخباری نمائندہ نہ ٹی وی نہ اے ذرائع خبر فرود چوک کھانی ہرمق بونگ چی سہ نیا بو یودسوک''۔ اس وقت اخباری نمایندہ ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ والے بھی ان کے ساتھ تھے(افسانہ شیخ ھسنگ لی،)

''شیخ ھسنگ لی'' آخوند اصغر علی بشارتؔ کا تخلیق کردہ ایک افسانہ ہے جسے ۲۰۱۴ میں لکھا گیا تھا۔افسانہ کا اقتباس کچھ اس طرح ہے:۔

''حاجی مختار شاہ رین چونگاس حج ملہ کھیونگسے دینبہ رین چوسچک عمرہ بیاسے لوقسے تھونمی انسوزیرے کوانہ دونمی نہ ژوخ لہ یولپہ رگا کھن کھار کھورنہ ہرنین دون چلتو فسوسے سونگسے بس نہ سومو،مارورتی نہ ینگ رن تھوس چن گاڑی قافلونگ نہ دریسے شکروئے جقلہ شامی بجہ تر و گیکہ کھوری تنگنو تھون۔یا وخلا اخباری نمائندہ نہ ٹی وی نہ اے ذرائع خبر فرود چوک کھانی ہرمق بونگ چی سہ نیا مبو یدسوک۔کھونی زیری خسپیر ونہ زومسے دینے فسوس می دیرنگ تہونی من گا سوئے لا سہ سونگفہ مید پا۔تو نپو کھونی زیریدنا یالا دینے حالات چی تھونگ دیونگ ہرژیا کھوا نگ می ین مہ تنگنو تھونمنہ کھوتی یولی لیگی بزورلو کھ چن عالم شیخ ھسنگ لی فیا قپوسی حاجی مختار شاہ لہ ژھے گا نینگ رین چونگاس حج ملہ کھیونگسے ینگ رین چوسچک عمرہ بیا سفولہ بوارک زیرس''۔۔الخ۔(ص۔ا)

بشارت صاحب کا دوسرا افسانہ **''چنگرہ''** کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اس افسانہ کا اقتباس کچھ اس طرح ہے:

<u>رحیم خان</u> روئندئے برژھوت <u>خاندان</u> چیگی شدینہ انپہ کھوس کھوری یولپونی فرو بلبیس کننہ یمبو <u>سرکاری سکولینگ</u>

داخلہ لینس ۔رحیم خان شنگپو اے فرونلگنہ لوخ یود پادے فری کھوکھوری جماعتی فرونگپہ گشا بزوکہ لیجمونمبر کننہ یمبو پاس گوید۔اما نواب رحیم خان کھوق لوکھ پوچھونچہ ہری ہریک یود پونہ زومسے استاد کنلہ گوٹھق بیاسے سبق پوگنگ رگیامہ بیاس۔سکولسنگ نہ بیونگفی جوکتوین کھائک ملازمت فیلا انٹر یوتنگس اما گارسہ کھوئے کنگما مہ کھرنگس۔یاتری نمزے چھونچہ رگلفی لزالاکھوکھورین روندوئے ہلچنگر یکہ تھون۔ہلچنگر یکہ ترانگپہ قلی خان نہ دریسے شربہ چوغی یولینگ اونگفی پینے نہ فنڈس کن چہ بیاسے سکیا تتوک زیربی گرف گروف کن بین یود پا۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے اردو کے محاورں کا بھی سہارا لیا ہے جیسے۔’’دیکا ہرژق نواب رحیم خان کھوری خچیری باربنگ زیرس(ملا کا دوڑ مسجد تک) چا زیربانا آخوندلا اردوکوئے میں سوک یا اردوئے باربنگ ملا نہ مسجد کوانہ ژندن لہ یوچھوڈ کہ نواب رحیم خان لہ ترنگپی عہدودرانگنہ ننگ مسجد امام جقپی انسوک‘‘۔

افسانہ ملہ گونڈ

اپونصیر مات نہ شکرمات بفراتی یولی لیگی نہ فیوکپو خاندان چیگی شیدینہ انپہ ۔کھونی قوم پویولینگ مات پازیرے نونے یود پا۔کھونگ فونونیسکوئے شیدیلہ نورنہ بنگ زنفے نہ مال دولت تھکھ چہ کھوانگ میدسوک۔اپوشکرمات ژھرماکا دونہ نصیرمات ژھونژے فونوانسوک۔اپوشکرمات نہ نصیرمات کھوتی سہ گیدنہ نوبنگلہ ہلتانہ نیامبوشگرگونہ ندپا ژھدپی خدمتنگ ہمیشہ ہورلنگ دوکپی ایتپا۔ینگ کھونگ نیسکو خدالہ فچو لبانا عبادتنہ سخاوتنہ نیامبوتھد کھارگانو نیگ گام یولی کھریمنہ زومسے سنینگ ترنگنہ۔کھدرانگ چی میدناسی ننگ چنگ لوقپاری جسم بےملا میدسوک۔

۔افسانہ ملہ گونڈ میں بشارت صاحب نے گاؤں کے حالات اور کوائف کو بیان کرنے کوشش کی ہے۔اس افسانہ میں اردو کے بہت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔جیسے قوم، مال و دولت ،خدمت، ہمیشہ،خدا،عبادت وسخاوت وغیرہ۔

عباس ضمیر جو ضلع کرگل سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے پرگی ربلتی میں تقریباً بارہ افسانے لکھے ہیں۔ان میں جو زیادہ مشہور افسانے’’لاسکیالی چھیما،شی گولق،گیس تھپ‘‘ ہیں۔ان افسانوں میں سے ایک افسانہ کا اقتباس بطور مثال پیش خدمت ہے :۔

افسانہ’’لاسکیالی چھیما‘‘

شن کھوربانا موسیٰ رحیمءِ نوزین سون کھورن بنکر چیگان ہلیب سے یودژوک۔سکومس چاس پوتراقسے کھوے ہلچے نہ رکوقھما ونلاژھیرمازوگیا ژوقس چھین یودژوک۔شن میدءمون پیک کھوری کہ کھیتے یودژوک۔کھوس ہمبا باسے کھوری کھرکھورلا

ہلتاس۔ زم زیم چھین چیک کھواتھون، کھوران نہ ایڑانیپالی گورکھیک رنیان ائیرفون چیک سکارے گو چوق تانین یود ژوگ۔ موسیٰ رحیم ئس کھوری رگوین یود پی کھیوتون گانمہ مل چیک باسے ناتی کہ کوس تابس۔ بب۔۔۔ بب۔۔۔ بہادر مم۔۔۔مم۔۔۔ مجھے پانی پلاؤ۔ کھوے زکوقمین ناسپراوکھریسین بین۔ گورکھاؤس واک مین ئیڈنا ہلوٹیا نین یود پانہ شپراؤ کھوے رنے کاماژھور۔ کھوس پھیرا کھا چیک کوس تابانہ سپراؤ کھوے رنیکہ ژھور۔ کھولانسے بالٹین پنینہ چھوچوسے موسیٰ رحیم ءِ لقپین تانمہ ناکورئیو کھوے لقپین ماخت پابوتے سون۔ گورکھاؤس ین ژھیر چیک چھوکھیو نسے کھوریس موسیٰ رحیم ءِ چھومینس۔ چھویک نینژ یک کھوے رکوقمیکنا تھورلا چھانا کھوے سناناؤ کئیو لیکہ مالی کہ یوٹس۔ (الخ)

اس اقتباس میں اردو کے الفاظ، مجھے پانی پلاو، موسیٰ رحیم، استعمال ہوئے ہیں۔ باقی رسم الخط اردو یا فارسی کا ہے اور تمام الفاظ و جملے بلتی / پرگی زبان میں ہیں۔

بلتی ادب میں افسانوی ادب کی طرح غیر افسانوی ادب کا میدان اتنا زرخیز نہیں ہے۔ تاہم بلتی ادیبوں نے ادب کے اس حصے کو بھی سرسبز و شاداب کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ بلتی زبان میں:۔

محمد یوسف حسین آبادی جنہیں بلتستان کے پہلے مقامی مورخ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۹۹۵ء میں آپ نے قرآن مجید کا بلتی ترجمہ شائع کر کے ایک اور تاریخ رقم کر دی۔ یوسف صاحب نے اٹھارہ سال کی عمر میں قرآن کو صحیح سمجھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس ارادہ کو پورا کرنے کے لئے انہیں سات سال لگا۔ ان سات سالوں میں انہوں نے صرف ونحو، منطق، معانی و بیان، اصول فقہ، فقہ وحدیث وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ بلتی زبان میں ترجمہ کرنے کا ہوا۔ اس میں انہیں انیس سال کا وقفہ لگا۔ ۱۹۹۲ء میں یہ کام پائے تکمیل تک پہنچا اور انیسو پچانویں میں کتاب شائع ہوئی۔ یوسف صاحب کا دعوایہ ہے کہ ان کا یہ ترجمہ بلتی زبان میں پہلا مطبوعہ نثری ترجمہ ہے۔

بقول موصوف:۔

قرآن کریم کے مطالعے کے شوق میں تحصیل علم کا سفر ۱۹۷۳ تک جاری رہا۔ اس کے بعد جوانی کے شب و روز اسی محبوب کی محبت میں بسر ہوئے جس کی محبت میں سالوں کا یہ سفر طے کیا تھا۔ اسی دوران ارادہ ہوا کہ قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کرلوں۔ ترجمہ کرنا گہرے مطالعے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ مترجم کو متن کے ان باریک گوشوں تک پہنچنا پڑھتا ہے جہاں جن تک عام لوگوں رسائی نہیں ہو پاتی۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ترجمہ کسی بندہ خدا کے دل و دماغ کو دھلا نیا نرملانے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف راغب کرنے کا سبب بنا تو اس حقیر کی بھی نجات کا سامان ہو جائے۔

بلتی زبان میں سورہ اخلاص کا ترجمہ پیش خدمت ہے:۔

☆☆۱۱۲۔سورہ اخلاص۔آیہ۴یود ☆☆

تھومید مہربان لیگی رحم چن خدائی مینٗ کھہ

کسل بیون کہ خداچیگ ژایود پی اِن ۔(۱) خدادے چن رگوس دوم مید کھن پو اِن ۔(۲) کھولہ سوسکیا سفی مین، ھنہ کھوان سولہ سکیا سونفی مین ۔(۳) ینٗ کھونہ دراچی سوچیگ مید پی اِن (۴) ۱؎

(۱۔آبادی محمد یوسف حسین،قرآن کریم،بلتی ترجمہ بلتستان بک ڈپو بلتستان پبلیکیشنز نیابازا،سکردو۔۱۹۹۵ء ص:۶۱۰)

دعا کمیل کا ترجمہ

بلتی زبان کے نثری حصہ میں ترجمہ شدہ دعا کمیل بھی اہم ہے جسے شیخ احمد مظہری نے ۱۴۳۵ھ میں تصنیف کیا ہے۔یہ کتاب ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں دعا کے بارے میں احادیث کو بلتی زبان میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد دعا کو بلتی ترجمہ کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔مظہری صاحب نے غدیری لو ہر ژلیس نامی بلتی زبان میں ایک کلینڈر کو بھی مرتب کیا ہے جس میں اسلامی واقعات کو دنوں اور مہینوں کے مطابق اور بلتی زبان میں ہر مہینہ کے حساب سے احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔مثلاً ''پیغمبر فیق پوسی کسل بیونید، نا علم شہر ان علی دیہی زگوان''۔اس جملے میں پیغمبر،علم،شہر،اور علی فارسی/اردو کے الفاظ ہیں۔

اقتباسِ دعا:۔

بارالہا نا یانگ لہ یری دے رحمت کن نہ دریسے نزگقسے جو ابید دونگ گا چیونگ گنگ می کھہ کھیدے یود، ینگ یری دے تھیک میدان نہ کھیود کن نہ دریسے نزگقسے جو بید دیہی سنیدی کھہ یانگ گا چیونگ گنگ می کھہ تھوسے یود ینگ دیہی دونو گا چیونگ گنگ مہ سی گونگ زگوسے یود۔

(مظہری،شیخ احمد حسین؛دعا کمیل،مجمع جہانی اہل بیت،۱۴۳۵ھ)ص:۱۷)

صحیفہ مہدیہ

بلتی زبان کی نثری کتب میں ایک کتاب ''صحیفہ مہدیہ'' ہے۔یہ کتاب جناب احمد حسین مظہرے نے مرتب کی ہے۔اس کتاب میں امام سجادؑ کی دعا پر مبنی کتاب ''صحیفہ سجادیہ'' کی طرز پر بلتی زبان میں صحیفہ سجادیہ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ کتاب سنہ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ میں شائع ہوئی اور یہ ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ایک اقتباس کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

''ستو دکھ نہ شکر پو دی لدن چوک کہن اشی لہ ان دی ذات پوسی نتی کھوم لوہ سی فری کھوری جوگی پیغمبر فیق پو فیسے تنگس دیبانا کھوری ہدایت سونگفی رگا کہن ائمو نی رگلوہ پوندا نگ لہ نون چوکس چھوس پوگنگ ژگیہ گوا فری دیبانہ عمل کنی رول شوق کو چوک پہ فری ینگ لیا خموا اخلاق شیدانہ فچو ہا گوے لس لقتو کھیونگ مہ فری نتی ہدایت بیاس''۔۔

اس اقتباس میں شکر، ذات، ہدایت، عمل، اخلاق جیسے اردو اور فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(مظہرے، احمد حسین؛ صحیفہ مہدیہ، سجاد آباد، شگر، ربیع الاول ۱۴۲۷ھ، ص:۲۰)

توضیح المسائل

شیخ غلام حسین خطہ لداخ کے ایک بزرگ عالم دین ہیں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ایۃ اللہ محسن حکیم کی کتاب ''توضیح المسائل'' کا ترجمہ بلتی میں کیا ہے یہ کتاب تین سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب سے ایک اقتباس نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو۔

وضو ارتماسی :۔ مسئلہ ۲۶۷، وضوی ارتماسی دو ان انسان وضو ستف سیکہ غدونگ، لقپاون، میک سنو بابا دون چھو ینگ تنگما وضوے ستف سیکہ فیونگسے کھیونگما۔ (رسالہ عملیہ۔ ص ۴۵)

اس اقتباس میں فارسی/اردو کے الفاظ وضو، ارتماسی، انسان وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

بہشتی لم ستن

بلتی/پرگی زبان کے ایک اور مشہور تخلیق کار کا نام جناب شیخ محمد حسین ذاکری ہے۔ موصوف نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ''بہشتی لم ستن'' ہے۔

جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں دینی مسائل کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو فارسی اثرات کو جاننے کے لئے بطور نمونہ ایک اقتباس کو لیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

''دی مختصر پولا حضرت آیت ال۱۰۰۰ العظمی امام خمینی مدظلہ العالی فیا قپوے فتوانا زومسے ژھیر تنگما سونگسید دے فیا رانگی کم زوری پیش نظر مومن کنی اطمنانی مینگنہ۔''

اس اقتباس میں، حضرت آیت اللہ العظمی امام خمینی مدظلہ العالی، فتوا، کم زوری، پیش، نظر، مومن، اطمینان۔ جیسے اردو اور فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(ذاکری، محمد حسین؛ بہشتی لم ستن، باغ خمینی، کرگل، ۱۹۸۹ء، ص:۶)

نتی ادب:

نتی ادب ایک رسالہ ہے جو بلتی زبان میں شائع ہوتا ہے۔اس میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور یہ دو حصوں حصہ نثر اور نظم پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ تقریباً ششماہی نہیں تو سالانہ ایک بار ضرور شائع ہوتا ہے۔۲۰۱۰ کے رسالہ سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔جس سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ دوسری زبانوں کا بلتی پر کتنا اثر پڑا ہے۔ملاحظہ ہو۔

''دی تر یوے کہ کرگل ءتقریباً ۹۵ فیصد میونگ دائرہ اسلامینگ شامل سونگ سے،میونگنی عقیدہ نہ تہذیب وتمدن نہ ادب نہ ثقافت چکتو دوسے اسلامی طرز وطریقے کہ رائج یودپی ان''۔

(نتی ادب؛سیکریٹری جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ،کلچر اینڈ لینگویجز،کرگل لداخ،،۲۰۱۰ء،ص:۳۶)

اس اقتباس میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔جیسے فیصد،دائرہ اسلام،شامل،عقیدہ،تہذیب ،تمدن،ادب،ثقافت،اسلامی طرز وطریقہ،رائج۔تقریباً آج کل بلتی زبان کے وہ الفاظ جو بذات خود کسی چیز سے منسلک ہوں یا موسوم ہوں انھیں متروک قرار دیا جارہا ہے۔اصل کو چھوڑ کر جو زبان سماج میں رائج ہوا سے استعمال کر کے مقالے اور دوسرے ادبی فن پاروں کو لکھے جارہے ہیں۔

فیچرس:۔برائے محرم الحرام از آخوند اصغر علی بشارت۔

ان دی لزو، پیغمبر ژھونچس حسین لوسے کھیرے
چھوچا دے فروفر ونگنہ دریسے کربلا لہ زگققی لزا
ان دی لز وچھوسی نیمولہ ظلمی راسی ہیوقسینا
خنم نہ ساٹھوب سونگسینہ نوریکہ ظلمت تراقفی لزا۔

بشارت صاحب نے فیچر کی ابتداء تو شاعری سے کی ہے لیکن وضاحت حروف مقطعات (کھیعص) کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقتباس:۔واقعہ کربلا حالت بیان نہ اشارہ سونگفی ان کاف حرف یوس اشارہ بید کربلا ھائیس ہلاکت یائی حرف یوس یزید لعین عین شید ینہ عطش یعنے اہل بیت سکومفے بیان اماصا دشید ینہ صبر نہ استقامت اشارہ گوید۔

فیچرس۔برائے محرم الحرام از آخوند اصغر علی بشارت۔

بشارت صاحب نے دوسرا فیچر بلتی مرثیہ سے شروع کیا ہے۔اس مقالے میں غیر مسلم افراد کی حضرت امام حسینؑ سے عقیدت اوران کے اظہار خیال کواس فیچر میں شامل کیا گیا ہے۔

ا پو چو ا حمد مختا ر حسین سونگسید د یڑ ے کھسمس

نلادوک چوکپہ مید ہائے ہائے یری قبر یکہ سہ خیا نگے ۔(الخ)

اقتباس:۔سلام نہ درود پو یر یکہ دوک یا رسولؐ اللہ یا حسین ان یری بونو چو چو فاطمی فنگمینگ ژھیر فی نا حسین ان یری تربیت تھوبفی دونہ امت برنگ لق ہرخلہ یقفی چکفر ژھوچپسپو ان۔

بقول محمد حسن حسرتؔ:

بلتی زبان میں نثر نگاری کا رجحان سوائے مذہبی کتابوں کے تراجم کے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔افسانہ یا ناول کا بلتی زبان میں پہلے وجود نہیں تھا۔البتہ نوجوان قلم کار محمد افضل روش نے پہلی بار بلتی میں کوشش کی ہے۔اورانکے افسانوں کا مجموعہ ''پھہ ہرتخ'' حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ریڈیو کے لئے نشری ڈرامے ضرور لکھے گئے۔ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے بلتی میں ڈرامے نشر ہونا شروع ہوئے۔۱۹۷۹ء میں ریڈیو پاکستان سکردو کے قیام کے بعد مقامی ڈرامہ نگاروں نے درجنوں سماجی،معاشرتی اور تاریخی ڈرامے لکھ کر نشر کیئے۔

بلتی ڈرامہ نگار حضرات کے تحریر کردہ ریڈیو سے نشر ہونے والے چند مقبول عام ڈرامے یہ ہیں۔

محمد علی خان واحد	ژھے سکیا لی بخستون اور لم تھق کن چدین
راجہ حامد حسین کلیم	زگا نگ لونگ،رگنژ راق،رنگارنگ،نقرم
آغا شاکر حسین شاکر	نانگنو بی بخستون،بائی روڈ،گڑھ کھیونگ،نورمید پاسترق مید شارگو
محمد عباس کھرگرونگ	چھوگنگ مے گنگ،غدیا نگمی نا یو،برق مقپوں،تھلدوم،برق بزنگ،نیلم چھیمو،حسیر ہلچنگ،ژروسی مے،نن زیل،بیوروزم
غلام عباس سودے	خلاد پھیونگ،ژیرک میرک،عید مبارک،منشور،جوڑ توڑ،نمائندہ اور گیا نگ سکور
غلام محمد بسمل	ردوسنینگ
محمد ہادی	نومہ پھودا
محمد حسن حسرت	لینگ یل اوررنگ مے
غلام حسن حسنی	بگوسکل،بگیا شر،کھڑیم سکنگ،سرات
وزیر محمد فیروز	زیستانگ

محمد حسن حسرت ان ڈراموں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''ان بلتی ڈرامہ نگاروں میں راجہ حامد حسین کلیم اور آغا شاکر حسین شاکر کے ڈرامے طربیہ وشگفتہ، محمد عباس کھر کرونگ کے ڈرامے المیہ اور غلام عباس سودے کے ڈرامے طنز ومزاح کی بہترین مثال ہیں۔ جبکہ محمد حسن حسرت کے ڈرامے بلتستان کی تاریخ وتہذیب کے عکاسی ہیں۔ باقی ڈرامے بھی معاشرتی اونچ نیچ اور اصلاح معاشرہ کے لئے لکھے گئے شہکار ہیں''۔

(ا۔تاریخ ادبیات بلتستان،ص:۱۱۵)

بلتستان کے علاوہ لداخ میں بھی پرگی ربلتی میں ریڈیو اور اسٹیج کے لئے ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ کچھ ڈراموں کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

کھار گیا فسی لوقسہ۔

یہ ڈرامہ آخوند اصغر علی بشارت کا تصنیف کردہ ڈرامہ ہے۔ ڈرامہ کو کچھ اس طرح لکھا گیا ہے۔۔

ڈرامہ:۔(اپو دیندار) اوھوق اوھوق اوھوق السلام علیکم (بابو انتظار) علیکم السلام لے اپو دیندار گیوخفا نہ کھل پخ کھوانگ مدفہ کھوق رگیال اونین گار گوئے ان۔ ندمید نہ یودا (اپو دیندار) اوھوق اوھوق اشپی شنز دے لے بابو نی نسوئے تھنا لاتھون۔ ہلڑھمہ ملسی کا تھونمی نصیب چہ گیگا زیرے پاس چہ فچو اگوئے ان۔ نالا مال دولت چنگ تھک تھنے میدلے بابو بنگ خسو مینگ ناس پینے یقسے یود۔

یہ ڈراما اپو دیندار، بابو انتظار، اپوکلبی، حوا، برکت شاہ، گلنار، شاہ نواز، منیجر۔ مستری اور ڈرائیور جیسے مختلف کرداروں کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس میں اہم کردار اپو دیندار، بابو انتظار، اپوکلبی اور حوا کے ہیں۔

اچھے سکیا لبا سوتنگ چین۔ اس ڈرامہ کے مصنف، نصیر الدین خفی اور ہدایت کار کاچو احمد خان ہیں۔

ڈرامہ کے کچھ مکالمے:۔ یاوا کا کا مرجان۔ ینتی لوسرا لا گیومے قیوق خسم چینگ سے نا۔۔۔

ا۔لوسر بلتستان اور لداخ میں ایک تہوار کا نام ہے۔

گوز نہ گوز تھیم پی کا ننگ پوجق سے نا۔

آخری مکالمہ پرگی ربلتی ضرب المثل پر ختم ہوتا ہے۔''ستقر پہ مالھبا ستقر پے ژھنگس چونا'' گیار لیگ ماسونگ۔ (یعنی خیال کچھ اور حقیقت کچھ اور)

اس ڈرامہ میں تقریباً تمام الفاظ اور جملوں کو مقامی زبان میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ بلتستان کے کئی عالموں اور ادیبوں نے مذہب، سیاست، ادب اور دیگر موضوعات پر اردو اور بلتی

میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔جن سے نہ صرف بلتی زبان وادب کے سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے بلکہ خطہ کے لوگوں کے فکرو نظر میں بھی تبدیلی آئی ہے۔

شیخ محسن علی نجفی

شیخ محسن علی نجفی بلتستان کے ایک جید عالم دین گزرے ہیں۔انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔جن میں اسلامی فلسفہ اور مارکسزم،محنت کا اسلامی تصور،فلسفہ نماز،رہنما اصول اور انقلاب حسین پر محققانہ نظر قابل ذکر ہیں۔اور یہ تصانیف ان کے علم وفضل کا بین ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

شیخ فخر الدین

شیخ فخر الدین معروف عالم دین ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی کتاب 'الموسوعہ فی الفقہ' معنی خیز او رضخیم ہے۔جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ان کی دوسری تصنیفات 'صحیح بخاری محققین کی نظر میں،سوانح ائمہ اربعہ،فلسفہ احکام اسلامی،شیعہ محققین اہل سنت کی نظر میں،الموضوعات اور سلاسل صوفیہ سنت وبدعت ہیں جو بلتی زبان وادب اور لوگوں کے فکر ونظر پر براہ راست یا بالواسطہ طور اثر انداز ہوئی ہیں۔

سید مہدی سرہاز

سید مہدی سرہاز ایک معروف عالم دین،شیریں بیاں مقرر اور بلتی اور اردو کے ہمہ گیر شاعر تھے۔آپ نے سید علی خامنہ ای کی کتاب 'توحید'،شہید محمد جواد کی کتاب 'کائنات' اور ڈاکٹر مدنی کی تصنیف 'اسلامی جمہوریہ ایران کا آئین،کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

محمد قاسم نسیم

محمد قاسم نسیم کی کتاب 'بلتستان۔تاریخ وسیاست (۱۹۹۴ء) خطے میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔جس میں بلتستان کے مسائل،لوگوں کی امنگوں،مطالبات اور تحریکوں پر بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔

غلام حسن سہروردی

غلام حسن سہروردی کی تصنیف 'تاریخ بلتستان (۱۹۹۲ء)' اپنے موضوع پر ایک منفرد تصنیف ہے۔یہ بلتستان کی تاریخ اور ثقافت پر لکھی گئی کتابوں میں ایک نیا اضافہ ہے۔

وزیر غلام مہدی

وزیر غلام مہدی تاریخ داں ہیں۔ان کے اہتمام سے قراقرم، کا مجلّہ شائع ہوا۔وزیر مہدی نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ اور سیاسیات میں ایم اے کیا تھا۔

محمد علی مہدی

محمد علی مہدی خطہ بلتستان کے ممتاز ماہر تعلیم ہیں۔انہوں نے اسلامیات میں ایم اے کیا ہے۔اور بی ایڈ اور ایم ایڈ کی ڈگریوں کے علاوہ انگلینڈ میں درس و تدریس کے شعبہ میں ٹریننگ لی ہے۔موصوف نے بلتستان کے اسکولوں کے لئے آسان بلتی قاعدہ مرتب کیا ہے اور جماعت چہارم تا ششم گرامر قلم بند کیا ہے۔آپ نے ایک رسالہ ''سکرچن'' کا اجرا بھی کیا تھا۔محمد علی مہدی نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

محمد نذیر

محمد نذیر نے حلقہ علم و ادب بلتستان کے جنرل سکریٹری کی حثیت سے کام کیا ہے۔انہوں نے ہفت روزہ 'سیاچن' اور ہفت روزہ 'شمال' کے لئے بلتستان سے متعلق ادبی مضامین لکھے ہیں۔

سید بہادر علی سالک وفدا حسین غاسینگی

سید بہادر علی سالک ہفت روزہ 'سیاچن' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔انہوں نے بلتی ثقافت اور تمدن پر متعدد مضامین لکھے ہیں اور فدا حسین غاسینگی کی بلتی زبان اور ادب پر گہری نظر ہے۔

محمد یوسف حسین آبادی

کمال الہامی نے لکھا ہے کہ:۔

بلتی زبان و تاریخ پر تحقیق کرنے والے پہلے معاصر محقق ہیں۔یوسف حسین آبادی فارسی، اردو، انگریزی اور بلتی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔وہ ادیب، محقق، مورخ، ماہر تعلیم، مترجم اور ماہر لسانیات ہیں۔تاریخ 'بلتستان پر ایک نظر'' اور ''بلتی زبان'' ان کی معروف کتابیں ہیں۔یوسف صاحب عمیق اور گہری فکر رکھنے والے محقق اور دانشور ہیں۔جناح پبلک سکول اور جناح کالج کے نام سے بلتستان میں پہلا نجی تعلیمی ادارہ قائم کر کے بلتستان میں تعلیمی انقلاب لانے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔یوسف صاحب نے جناح پبلک سکول میں ایک مثالی لائبریری قائم کی ہے جس میں تمام موضوعات اور زبانوں کی کتابوں کے علاوہ ایک گوشہ شمالی علاقہ جات کے لئے مخصوص ہے۔ا

غلام حسن لوبسانگ

کمال الہامی نے غلام حسن لوبسانگ کی ادبی خدمات کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

غلام حسن لوبسانگ نے فطری طور پر فلسفیانہ ذہن، تحقیقی فکر اور تخلیقی سوچ پائی ہے۔ان کی تحقیقات وتخلیقات کا میدان نثری ادب ہے۔ان کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔بلتستان کی تاریخ وثقافت، جغرافیہ، زبان اور نسلی گروہ کا مطالعہ کرنا اور اس کے ماحصل پر اپنا خاص نقطہ نظر قائم کرنا ان کا خصوصی مشغلہ ہے۔

بلتستان بھر کے محققین اور ادیبوں میں وہ ایک خاص اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں جو مقام حاصل ہے اس میں اب تک کوئی شریک سفر نہیں۔ان کا خصوصی مضمون ہے''اقصائے تبت کی جیو پولیٹیکل تاریخ''اس راستے میں تاہنوز وہ اکیلے ہی سفر کر رہے ہیں۔''می منگ رگیاستر یدبلتستان'' کے نام سے خاص نمبروں پر مشتمل ان کے تاریخی سلسلہ وار رسالے ''لوبسانگ' کیسار'لوسار'یول ان اور سانگ'اس خصوصی مضمون پر ان کی گرفت مضبوط ہونے کی واضح دلیل ہے۔یہ پانچ خصوصی شمارے قدیم ترین زمانے میں بلتستان کے قریبی علاقوں کے ساتھ جغرافیائی، سیاسی'لسانی اور تاریخی تعلقات پر مبنی تحقیقی جائزے ہیں۔غلام حسن لوبسانگ کی باقاعدہ کتابیں درج ذیل ہیں۔

پوسکد (قومی زبان) یہ کتاب بلتی زبان کے قانون پر مشتمل ہے۔یہ کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔انگریزی گرامر برن یونیورسٹی سوئیٹزرلینڈ سے شائع ہوئی ہے''تاریخ بون مذہب''اس کتاب میں علاقائی فلسفہ کی تاریخ لکھی گئی ہے۔اور اس میں پانچ سو اقوال زریں بلتی میں منتقل کئے گئے ہیں۔جن میں سے سوان کے اپنے اقوال ہیں۔غلام حسن لوبسانگ بلتی زبان اور گرامر اور بلتستان کی قدیم تاریخ کے لئے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔۲

(۱،۲۔نگارشات بلتستان، سودے بکس، پبلیشر بک سیلر سپلائیر علمدار روڈ، سکردو۔۲۰۰۵ء)

بلتستان کے دیگر نامور ادباء جیسے پروفیسر حشمت علی کمال الہامی، سید محمد عباس کاظمی، غلام حسن حسنی کے بارے میں حصہ شاعری میں ان کی ادبی خدمات کا ذکر ہو چکا ہے۔محمد یوسف حسین آبادی اور غلام حسن لوبسانگ صاحب کا تعلق صرف اور صرف نثری حوالے سے ہی تھا اس لئے ان کا ذکر حصہ نثر میں کیا گیا ہے۔

بلتی اردو لغات:

ہر وہ زبان جو بولی اور سمجھی جائے ادبی نہیں ہوتی۔البتہ ہم اسے بولی تو کہہ سکتے ہیں لیکن زبان وادب کے زمرے میں اسے شمار نہیں کیا جاتا۔زبان کے لئے ایک خاص گرامر اور قواعد کا ہونا ضروری ہے۔اور الفاظ کا ذخیرہ بھی ہونا چاہئے۔بلتی زبان ایک جامع زبان ہے۔اس زبان کے گرامر اور لغات موجود ہیں۔غلام حسن لوبسانگ نے بلتی لغت

اور گرامر کی کتاب تصنیف کی ہے۔

محمد حسن حسرت نے صبا صاحب کی کتاب ''بلتی لغت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''بلتی زبان تبّتی زبان کی مغربی شاخ ہے۔تبّتی زبان تبت کے علاوہ بھوٹان، نیپال کے علاقے شرپا، چین کے یونن، سیچھوان، ژھینگائی اور گانسو جبکہ ادھر لداخ، کرگل اور بلتستان میں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے۔اگر چہ تبّتی زبان کی اب تک کم وبیش درجن بھر لغات منظر عام پر آئی ہیں لیکن وہ تمام لغات یا تو تبّتی رسم الخط ''اگے'' میں ہیں یا رومن طرز تحریر میں۔نیز لغات زیادہ تر لداخ، تبت، نیپال اور بھوٹان وغیرہ کے لہجوں پر مشتمل ہیں۔البتہ دو انگریز مہم جو اے ایف سی ریڈ اور ڈاک سپرگ کی بالترتیب رومن طرز تحریر میں بلتی گرامر مع فرہنگ اور بلتی انگریزی لغت انہی کوششوں کے سلسلے کی کڑیاں ہیں لیکن وہ لوگ چونکہ اہل زبان نہیں تھے۔اس لئے وہ اس زبان کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔راجہ محمد علی شاہ صبا عصر حاضر کے بلتی شاعروں اور زبان دانوں میں تاج فضیلت رکھتے ہیں۔اور زیر تبصرہ لغت ان کے طویل تجربات، قوت حافظہ اور توانا جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔راجہ صاحب نے نو ہزار سے زائد بلتی الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کی شیرازہ بندی کر کے سلیس اور شستہ اردو معانی کے ساتھ یہ لغت مرتب کیا ہے۔یوں بلتی زبان کو ایک نئی زندگی سے سرفراز کیا ہے''۔

(نگارشات بلتستان؛ بلتستان دائرہ نگارش، سکردو، ۲۰۰۵، ص:۲۱۸)

بلتی گرامر اور بول چال:۔

کسی بھی زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے گرامر ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔اور جب تک یہ علم تحریر میں نہ لایا جائے زبان پر عبور حاصل کرنا ناممکن ہے۔فدا حسین کی بلتی گرامر مرتب کرنے کی کاوش اس لحاظ سے نہایت قابل تحسین ہے کہ اس کے ذریعے بلتی زبان کی ترقی میں بے انتہا مدد ملے گی۔(کرنل عبدالعزیز، ناظم تعلیم شمالی علاقہ جات)

شاہ صبا نے بلتی گرامر اور بول چال کے تعارف میں لکھا ہے کہ:۔

''احیائے ثقافت وتاریخ اور تحفظ وحی شرت کے سلسلے میں نئی نسل کے روشن دماغ، باشعور اور سرگرم کارکنوں نے میدان عمل میں نکل کر قومی ورثے کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ان میں جناب فدا حسین صاحب ہزار داد کے مستحق ہیں جنہوں نے بلتی زبان کے لئے گرامر مرتب کر کے ایک نمایاں کارنامہ سرانجام دیا ہے۔نظامت تعلیم کی لامحدود مصروفیتوں کے باوجود یہ ان کے قومی جذبہ اور اپنی زبان کے ساتھ بے تحاشہ وابستگی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کے لئے مواد جمع کرنے، یار دوستوں سے مشورہ کرنے اور مسودہ تیار کرنے میں بہت قلیل عرصہ صرف کیا۔یہ ان کی محنت شاقہ اور رات دن کی لگن کا ثمر ہے۔ان کی بے لوث تڑپ اور روز وشب کی کاوشیں ان چند تعریفی کلمات سے بلند تر ہیں۔

چونکہ گرامر کسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ گرامر بلتی زبان کے لئے تیار کی گئی ہے۔اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا

ہوں کہ قارئین کو بلتی زبان سے اپنی استطاعت کے مطابق متعارف کراؤں۔تا کہ اس کتاب کا پڑھنے والا اس زبان کے نشیب وفراز اور حسن وقبح سے کما حقہ مستفیض ہو سکے۔

قرون وسطیٰ میں تبت جو مغرب میں بلتستان، مشرق میں لداخ اور لہاسہ، جنوب میں موجودہ بھارت کی چند شمالی ریاستیں اور شمال میں اقصائے چین تک پھیلے ہوئے ایک علاقے کا نام تھا۔اس پورے علاقے میں بدھ مت کے پیروکار آباد تھے۔ان کے عقائد، ان کی زبان وتہذیب اور معاشرے پر تبت کی حاکمیت مسلط تھی۔اس بات کا کوئی مسلمہ ثبوت نہیں ہے کہ اس زبان کا نام ''اگیہ'' تھا گو کہ بلتستان کے بعض دانشوروں کا خیال ہے بلکہ ان کی تحقیق ہوگی کہ یہی بلتی زبان ''اگیہ'' تھی اور موجودہ بلتی زبان اس ''اگیہ'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

مسٹر ایچ اے حشکے نے جو ''برطانوی لاھول کے کیلانگ ضلع میں موراوین (Moravian) مشنری کی طرف سے تبلیغ دین مسیحی پر مامور تھے۔'' ایک ڈکشنری A Tibetan -English Dictionary کے نام سے مرتب کیا ہے اس میں ''اگیہ'' زبان کے نام سے کوئی لفظ موجود نہیں ہے بلکہ تبتّی زبان لکھا گیا ہے۔

بہر حال ''اگیہ'' یا تبتّی'' تبت خورد میں اس وقت متاثر ہوئی جب یہاں دین اسلام کے مبلغین اور ہادیان دین مبین نے عربی اور فارسی زبان کی درس وتدریس کا نورانی دریا بہایا۔اس کی زد میں آ کر ''بون مت'' اور بودھ مت'' کے عقائد کے ساتھ ساتھ تبت خورد یعنی زنسکار۔کرگل اور بلتستان تبتّی زبان کے حلقہ اثر سے نکل گیا۔اس زبان میں عربی اور فارسی زبان نے غلبہ حاصل کیا ایک نئی تہذیب وثقافت اور ایک نئے معاشرتی ڈھانچے نے جنم لیا۔بلتستان میں بلتی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور اس رسم الخط میں فقہ کی کتابیں، درسی کتب، جنگی کارنامے اور اردو وظائف، حمد ونعت، حضرات معصومین کے قصائد اور مراثیے، تاریخی واقعات، نثر ونظم میں منضبط ہوئے شعر وشاعری کا ایک بیش بہا سرمایہ اس رسم الخط میں موجود ہے۔اب لاکھ جتن کرنے اور ہزاروں خواہشات کے اظہار کے باوجود موجودہ بلتی زبان کا پھر اسی تبتّی یا اگیہ رسم الخط میں فروغ پانا ناممکن ہے۔صدیوں بعد تمام متبرک اور تاریخی مخطوطات جو بلتستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں دوبارہ (اگیہ) میں منتقل کرنے کا خیال ہی ناموزوں اور غیر منطقی ہوگا۔

(غاسنگی، فدا حسین، ولایت علی؛ بلتی گرائمر اور بول چال، سودے بکس لنک روڈ، سکردو، ۲۰۱۱، ص:۶)

الغرض صبّا صاحب نے بلتی رسم الخط اور بلتی زبان کی اہمیت کو تاریخی حوالے سے قارئین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اور اسی کے ساتھ ساتھ فدا صاحب کی اس تحریر کی بھی سراہنا کی ہے۔

لداخی انگریزی اور اردو لغت

عبدالحمید کا نام لغت نویسی میں خاص اہمیت کا حامل ہے ان کی لغت ''لداخی انگریزی اور اردو لغت'' ہے۔موصوف نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ لداخی انگریزی اور اردو کی یہ لغت اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے۔ بودھی/انگریزی اور بودھی/ہندی میں اس سے پہلے ڈکشنریاں مرتب کی گئی ہیں۔اسی طرح بول چال لداخی اور انگریزی میں ڈکشنری منظر عام پر آئی ہے۔تاہم لداخی (اردو) میں ایک لغت کی ضرورت لمبے عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ریاست جموں وکشمیر میں خصوصی طور پر اور ملک میں عمومی طور پر اردو دانوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ملازمت اور تجارت کے سلسلے میں لداخ آنے والے متعدد ملکی اور غیر ملکی سیاح لداخی زبان سیکھنے یا جانکاری حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

لہذا ان سے مجھے یہ لغت مرتب کرنے کی تحریک ملی۔انگریزی/اردو اور لداخی زبانوں میں بقدر ضرورت واقفیت اور زبانوں اسکالروں کے تعاون کے بل بوتے پر میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تا کہ لوگوں کے شوق کو پورا کرسکوں۔

قواعد (Grammer) کے تحت بودھی لداخی زبان سیکھنے کے لئے انگریزی اور اردو میں ایک ایک باب الگ سے پیش کیا گیا ہے تا کہ انگریزی اردو دانوں کو لداخی زبان سیکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔لغت میں پانچ ہزار سے زائد لداخی الفاظ دیئے گئے ہیں۔

(عبدالحمید؛میلونگ پبلیکیشنز لیہہ،لداخ،۱۹۹۷ء)ص:xxiii)

ھدایۃ الطالب الی اللغۃ

''ھدایۃ الطالب الی اللغۃ'' یہ لغت محمد علی حلمی خلف الشیخ غلام حسین لمسوی الپکرستان کی تالیف کردہ لغت ہے۔اس میں عربی، فارسی اور پرگی الفاظ موجود ہیں یہ لغت اٹھانویں صفحات پر مشتمل ہے۔موصوف نے یہ لغت عراق میں طالب علمی کے دوران لکھی ہے۔

مجمع اللغات

مجمع اللغات سید حسین الموسوی کی تالیف کردہ لغت ہے اس لغت میں عربی، فارسی، اردو، پرگی اور بلتی الفاظ موجود ہیں۔یہ لغت سن ۲۰۱۲ میں چھپی ہے۔

سید حسین الموسوی اپنی اس لغت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ کتاب (مجمع للغات) عربی، فارسی، اردو، پرگی، بلتی، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے پایہ تکمیل تک پہنچی، اس کا اصل مقصد صرف خدمت خلق ہے، اور عربی فارسی سیکھنے کے شوق رکھنے والے حضرات کے تسہیل

تفہیم کے لیے،اورا پنی مادری زبان کوفروغ دینا ہے۔

ہماری پرگی زبان کی ترقی اوراس کے کھوئے ہوئے الفاظ ومعانی کوحتی المقدورجمع آوری کر کے قوم کی نئی نسل کو تحفے کےطور پراسے پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب ۴۴۲صفحات پر مشتمل ہے۔(امبہ،سید حسین الموسوی؛مجمع اللغات،کرگل)

الغرض بلتی زبان میں نثری موادنظم کے مقابلے میں بہت کم ہے۔نثری اصناف،داستان،افسانہ،ڈرامہ،فیچروغیرہ میں ابتدائی نثری تخلیقات کی بہ نسبت نثری تحریروں میں زیادہ تر اردو فارسی کے الفاظ ستعمال کیے جارہے ہیں۔

(حصہ دوم)

بلتی کہاوتوں پر اردو کے اثرات

بلتی زبان میں کہاوت کو 'تم لو' کہا جاتا ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح بلتی زبان میں بھی کہاوتیں ملتی ہیں۔ یہ کہاوتیں صدیوں کے تجربات ومشاہدات کا ثمرہ ہیں۔ ان میں عمیق خیالات اور فلسفیانہ باتیں مخفی ہوتی ہیں۔ ان کہاوتوں میں علم و دانش کی باتیں اور فکر ونظر کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ کچھ کہاوتوں کا پس منظر کوئی نہ کوئی تاریخی یا سماجی واقعہ ہوتا ہے۔ بلتی کہاوتوں پر متعدد کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں ان کہاوتوں کی انگریزی اور اردو متبادل کہاوتیں دی گئی ہیں یا ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ متعدد کہاوتوں میں اردو کے الفاظ اور اسلامی نام پائے جاتے ہیں جو اردو کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد حسن حسرت بلتی کہاوتوں کی خصوصیات اور امتیازات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ضرب الامثال جسے بلتی زبان میں تم لو کہتے ہیں۔ اس مقولے کا نام ہے جو مختصر، جامع اور بصیرت افروز ہو۔ جس میں کسی عبرت انگیز اور نصیحت آموز قصے یا واقعے کی جانب اشارے ہوں یا جو کسی معاشرتی، معاشی، جغرافیائی یا سیاسی پس منظر کے تحت کہا گیا ہو۔ انہیں دیار ادب میں خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ ان کے لفظوں کے معنی اخذ نہیں کئے جاتے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ ایک معنوی مفہوم وابستہ ہوتا ہے۔ جس کا تعلق براہ راست عوامی ورثے یا لوک ادب سے ہے یہ کسی قوم کی مشترکہ میراث ہوتی ہے اور کوئی شخص ان کی تخلیق کا دعویدار نہیں بن سکتا۔ یہ ضرب الامثال تحریر وتقریر دونوں میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ فصاحت وبلاغت بھی پیدا کرتی ہیں۔ جب ایک عام آدمی کسی ضرب المثل کو اپنی گفتگو میں استعمال کرتا ہے تو اس کے دل کو تسکین مل جاتی ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے اپنی گفتگو میں ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ا

ہر زبان اپنے دامن میں مخصوص ضرب الامثال اور محاورات کا سرمایہ رکھتی ہے۔ ان کے استعمال سے باتوں میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ بلتستان اور لداخ میں بولی جانے والی بلتی زبان میں ضرب الامثال اور محاورات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ بلتی ضرب الامثال اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں جو سادگی، گہرائی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے وہ بلتیوں کی فطرت اور ان کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلتستان کی محفلوں میں لوگ ضرب الامثال کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بحسن خوبی کرتے ہیں۔ ان کے استعمال سے بلتی تہذیب وتمدن اور ثقافت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ محمد حسن حسرتؔ لکھتے ہیں:

بعض بلتی ضرب الامثال ان رسومات اور روایات کی نشاندہی کرتی ہیں جو یہاں کی عوامی زندگی اور تمدن کا اہم جزو ہیں

ان میں زیادہ تر عوام کے تجربات اور مشاہدات شامل ہیں جو روزمرہ زندگی کے حقائق کو اشکارا کرتے ہیں۔الغرض بلتی معاشرہ میں ضرب الامثال نے زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا (ہوا) ہے۔اس لئے اسے عوامی ادب کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے یلتستان کی عوام ضرب الامثال کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ان کے لئے یہ ضرب الامثال ایک ایسا کیسہ ادب ہیں جن میں بڑے بڑے مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں۔جو یہاں کی اجتماعی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔یہ ضرب الامثال ہمارے بزرگوں کی عقل ودانش،فراست وبلاغت کے زندہ ثبوت ہیں جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں۔

(ا۔حسرتؔ،محمد حسن؛ تاریخ ادبیات بلتستان،ٹی ایس پرنٹرز گوالمنڈی،روالپنڈی،نومبر۱۹۹۲ء،ص:۷۹)

ضرب الامثال اور محاورے زبان میں روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو اصطلاح میں انھیں ''کہاوت'' بھی کہتے ہیں۔جس طرح نمک کے بغیر ذائقہ نہیں ملتا اسی طرح کہاوتوں اور محاوروں کے استعمال کے بغیر گفتگو میں چاشنی نہیں آتی۔ماہرین عمرانیات کے نزدیک کہاوتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کہاوتیں متعلقہ سماج میں رہنے والے قدیم باشندوں کی فکری سطح،اجتماعی شعور،سماجی روابط،معاشی صورتحال اور معاشرتی وثقافتی اقدار کی عکاس ہوتی ہیں۔ان کہاوتوں کے صرف لفظوں سے معنی اخذ نہیں کئے جاتے بلکہ ان کے ساتھ ایک گہرا معنوی مفہوم بھی وابستہ ہوتا ہے۔جس کا تعلق براہ راست عوامی ورثہ سے ہوتا ہے اور ان میں حکمت ودانائی کے راز مخفی ہوتے ہیں۔

غلام حسن حسنیؔ کی کتاب ''تم لو'' کے دیباچہ میں حسرت صاحب لکھتے ہیں:۔

بلتستان میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ''بلتی'' کہلاتی ہے یہ تبّتی زبان کی مغربی شاخ ہے۔جو بلتستان،کرگل اور لداخ میں معمولی فرق کے ساتھ بولی جاتی ہے۔بلتی زبان اپنے دامن میں ضرب الامثال اور محاورات کا انمول خزانہ رکھتی ہے جو بلتستان کی صدیوں پرانی تہذیب وثقافت اور زبان وادب کے حسین شاہکار ہیں۔ان کہاوتوں اور محاوروں میں جو سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے وہ بلتیوں کی فطرت اور مزاج کا خاصہ ہے۔یہ بلتی ضرب الامثال اور محاورے اب تک لوگوں کے سینوں تک محدود تھے جنہیں بعض نکتہ سنج افراد محفلوں میں بوقت ضرورت اپنی گفتگو کے دوران استعمال کر کے زبان وبیان کا جوہر دکھاتے تھے۔اب محترم دوست غلام حسن حسنیؔ نے ان کہاوتوں اور محاوروں کو ایک لڑی میں پرو کر حوالہ قرطاس کیا ہے۔ا

(ا۔حسنیؔ،غلام حسن؛تم لو،شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار،سکردو،۲۰۰۴،ص:۹)

کاچو سکندر خان سکندرؔ نے این شائینٹ ویسڈم (Ancient wisdom) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

Ancient wisdom , reproducing a fairly large number of Ladakhi saying derived from various ancient ethnical circles and civilizations, Mons, Mongols and Aryans, now jointly represented by the Tibto-Dard population of this region , are manifestly _part of 'wisdom of the East '.the learned author ,my son k. Asfyandyar Khan M.A, after taking pains in

studying all the relevant sources of ancient saying and terminology has arranged and recoded the same in ladakhi language and script with translation and transliteration in Urdu and English-a colossal task .Age -old sayings reveal eternal truth which time cannot change though their face- value or effect may seem to differ from age to age, generation to generation.[۱]

(۱۔فریدونؔ، کاچو اسفندیار خان؛Ancient Wisdem، کاچو پبلشرز، کرگل (لداخ) جموں وکشمیر، ۲۰۱۴،ص:۱۲)

عبدالغنی شیخ کے بقول: لداخی کہاوتوں اور محاوروں میں اردو الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جیسے

خاخارا۔ نینگ آرہ۔ یعنی زبان کا میٹھا اور دل کا برا

خارا کھانڈ کا بگڑا ہوا لداخی لفظ ہے۔ آرہ بھی اردو لفظ ہے۔ جو ترکھان لکڑی چیرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

چھوکھیونگ کن کا شاباش میت۔ چھوکر چق کن لا کپ کیون میت

اس کہاوت میں اردو کا لفظ شاباش آیا ہے۔ کہاوت کا مطلب ہے کہ پانی لانے والے کو شاباش نہیں اور گاگر توڑنے والے کو ڈانٹ نہیں۔

اسی طرح بہت سارے محاورے (Phrases) ہیں جن میں اردو کے الفاظ ہیں۔ جیسے

کھیل تپ چیس۔ یعنی ہشیاری سے نفع کمانا یا فائدہ لینا۔

خوشی چن۔ متلون مزاج

منت چودوک۔ ٹرخا رہا ہے

ٹوٹا پھوق چیس۔ کمی پیش آنا

بو میدوگ۔ نام ونشان نہیں

حساب چیک دوک۔ تھوڑا بہت ہے

محمد حسن حسرت لکھتے ہیں:۔ بلتی ضرب الامثال اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں جو سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے وہ بلتیوں کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلتستان کی محفلوں میں لوگ ضرب الامثال کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ بلتی زبان ضرب الامثال کی دولت سے مالا مال ہے لیکن بکھرے موتیوں کی شکل میں لوگوں کے سینوں تک محدود ہیں جس کے نتیجے میں نئی نسل ان ادبی شہ پاروں سے نابلد ہوتی جا رہی ہے۔ البتہ بلتستان کے مقبول شاعر اور قلم کار غلام حسن حسنی نے بلتی ضرب المثل اور ان کی شرح پر مبنی کتاب

مرتب کر کے شائع کی ہے۔ چند بلتی ضرب الامثال اوران کا ترجمہ ملاحظ ہو:

ضرب المثل	ترجمہ
رگی ژھون پاتم ژھون ہلچو	زبان کی چوٹ تلوار کے وار سے بھی زیادہ بھاری ہے۔
لق ہرژیس لاگوت، کھہ ہرژیس لابروت	ہاتھ کے کھیل سے نقصان اور باتوں کے کھیل سے لطف۔
رواژالے سونگفی کھہ ژھیوناسہ برل	سینک کی تلاش میں جا کر سم سے بھی محروم ہو گیا۔ا

(ا۔حسرتؔ، محمد حسن؛ بلتستان تہذیب وثقافت، بلتستان بکڈ پوائنٹ پبلیکیشنز نیا بازار، سکردو، ۲۰۰۷ء، ص:۹۹)

خطہ لداخ سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر اور قلم کار کاچو اسفندیار خان کی کتاب (Ancient wisdom) سے چند ضرب الامثال کے نمونے، ترجمے اوران کی وضاحت ملاحظہ ہوں:

خدا لہ۔ژھے۔سکانید

سرکار۔لہ برے۔سکانید

اس ضرب المثل میں اردو، فارسی کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔خدا اور سرکار۔

Spending some how the life bestowed by God,

And paying the tax to the ruler in bushels.

This saying seems to have been coined during the Dogra rule in Ladakh.The Dogra Ruler of Jammu invaded Ladakh and in 1834 and annexed it with the Jammu kingdom.The Dogras levied heavy taxes upon the people of Ladakh while the people were hardly able to pay such heavy taxes.So they toiled and labored through out the year to earn enough to pay the tax of the govt.In the frist hand and then they arranged the livelihood for their family.Under these circumstances the people spent their lives miserably and longed often for early death.(p209)1

(فریدونؔ، کاچو اسفندیار خان؛Ancient Wisdem، کاچو پبلشرز، کرگل (لداخ) جموں وکشمیر، ۲۰۱۴ء)

چھون لہ۔تھوپ پی۔بہشت

ژالے۔کھیونکس پی۔دوزخ

Heaven will get free of cost

while hell will get by asking for it.

It means that reward for ones good deeds will come freely.however one will invite

misfortune or hell for himself by doing bad deeds and actions thus inviting the trouble for himself.(p182)

اس ضرب المثل میں اردو/فارسی کے الفاظ، بہشت اور دوزخ استعمال ہوئے ہیں۔

حسد/سمبا۔نن پہ۔جھن لہ۔بانہ

جورا۔نن پہ۔رنگ لہ۔لوق

If one wishes ill feelings for others, one may get the bad result of such feelings. It means that if someone harbors bad wishes for others, he or she will get the fructification of such ill feelings according to the law of cause and effect. Therefore even a bad intention and ill will for others, will harm the person himself. (p 215)

ا تا لہ ۔ بوُ پھیں ۔ مید

(سرکار)/چو۔لہ۔برن پھیں مید

All the sons are equal before a father,

All the subjects are equal before a ruler.

As a father treats his sons equally similarly a ruler is also supposed to treat his subject equally.A father who does not treat his sons equally may not be able to keep peace in his family.Likewise a ruler cannot afford to treat his subjects differently if he is keen to keep peace in his country.(p177)

چپ چدپی می ناکھ چدپی سنود

ترجمہ: خاموش انسان ڈھکن بند برتن کی مانند ہوتا ہے۔

اس ضرب المثل میں اردو کے لفظ 'چپ' استعمال ہوا ہے۔

کسی بھی کم گو اور خاموش طبیعت انسان کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگانا انتہائی مشکل ہوتا ہے کیونکہ گفتگو کے ذریعے ہی کسی انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور اس انسان کا پتا چلتا ہے۔مگر ایک ایسے انسان کو جس نے اپنی شخصیت کے اردگرد خاموشی کا ایک حصار قائم کر رکھا ہو پہچاننا آسان نہیں ہوتا۔یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کھڑے پانی کی گہرائی کا اندازہ کنارے پر کھڑے ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔(۶۵)

اماں/انوتھہ بی مے، اتار گیانی نیما

The love of a mother is like fire, the love of a father is like the rays of the setting sun.

ماں کی محبت یا ممتا چولہے کی آگ، باپ کی شفقت ڈھلتے سورج کی کرنیں۔

اس ضرب المثل میں ماں کی ممتا کو چولہے کی آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چولہے میں آگ جل رہی ہو تو یخ بستہ موسم میں انسان کو نفسیاتی طور پر سکون حاصل ہوتا ہے۔ سرد موسم کے حوالے سے ایک بلیغ استعارہ ہے۔ چولہے کی آگ سرد علاقے کے مکینوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ بھی آج سے برسوں پہلے جب یہاں کے باسی زندگی کی بیشتر سہولتوں سے محروم تھے۔ ضرب المثل کا دوسرا حصہ باپ کی شفقت کے حوالے سے ہے۔ دراصل اس ادب پارے میں ماں اور باپ کی محبتوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ باپ کی شفقت و محبت غروب ہوتے ہوئے سورج کی سی ہے۔ سہ پہر کے وقت غروب ہوتے ہوئے سورج کا منظر پہاڑی علاقوں میں قابل دید ہوتا ہے۔ بالخصوص سردیوں میں دھوپ میں تمازت بھی بہت کم ہوتی ہے۔ پھر ڈھلتے سورج کی کرنیں دیوار پر چند لمحے رکتی ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے۔ شام کے سائے پھیلنے لگتے ہیں۔ ضرب المثل کا لہجہ بتا رہا ہے کہ تخلیق کار نے باپ کی محبت کو ڈھلتے سورج کی کرنوں سے تشبیہ دی ہے ورنہ ہم باپ کی شفقت کو صبح کی پہلی کرن سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ (پ ۲۹۴)

روم سونگ نہ روم ہلڑاق

ترجمہ:۔ روم جائے تو روم بھی کنگال ہو جائے۔

مفہوم: منحوس، بیکار، اور کاہل آدمی جہاں بھی جائے نحوست لے کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ روم جیسے خوشحال شہر میں بھی جائے تو اس شہر کو بھی کنگال کر دے۔ تن آسان آدمی جس مقام پر پہنچا نتے ہے اپنے علاوہ اس جگہ کو بھی خراب کر دیتا ہے۔

کشمیر لاکھ زیر پھہ ژوخ

ترجمہ: یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کشمیر کو گالی دے۔

مفہوم: کسی اچھی چیز کو برے لفظوں میں یاد کرنا۔اس معنی کوادا کرنے کے لئے کشمیر کی مثال دی گئی ہے۔کشمیر جنت نظیر کے نام سے معروف ہے۔اب اگر کوئی شخص خوبصورت چیز کو گالی دے یا ناپسند کرے تو یہ فعل ایسا ہے جیسے کوئی بے وقوف کشمیر کے حسن کو گالی دے۔حالانکہ اس علاقے کا حسن تو چار دانگ عالم میں مشہور ہے

کچھ ایسے ضرب الامثال جس میں اردو زبان کے مفرد یا مرکب الفاظ تو موجود نہیں ہے لیکن یہ ضراب الامثال مستعمل العام ہیں جو مندجہ ذیل ہیں۔

ردوا چھووو کھورنہ میر دونگی سنگیاد

ترجمہ۔بڑا پتھر اٹھانا نہ مارے کا بہانہ

مفہوم۔جب انسان کی نیت کسی کام کو کرنے کی نہ تو وہ مختلف بہانے تلاش کرتا ہے اور عذر پیش کرتا ہے۔اپنی اس دکھاوے کی کوشش میں وہ اپنی زبان اور حرکت سے لوگوں پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیکھو میں نے تو اپنی ہر ممکن کوشش کر لی مگر پھر بھی یہ کام نہ ہو سکا شاید قسمت کو یہی منظور تھا۔اس طرح سے وہ اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔(ص۲۷۲)

ھرتھہ تھرونہ می تھوونہ

ترجمہ: گھوڑے کو سکھنا ہے تو بچپن سے انسان کو سکھانا ہے تو بچپن سے

مفہوم: کوئی بھی علم یا ہنر اگر صحیح وقت پر سکھایا جائے تو فائدہ مند ہوتا ہے۔غلط وقت پر خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے خاطر خواہ نتائج ہرگز حاصل نہیں کئے جا سکتے۔اس لئے اس ضرب المثل میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ انسان ہو جانوا گر بچپن ہی سے اسے تربیت دی جائے تو فوراً سیکھ لیتا ہے۔جب کہ بڑے ہونے کے بعد تربیت کا عمل انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ (ص:۲۶۴)

کھہ نا بودے تھوا تھوانا بودے سہ

ترجمہ: منہ سے گر کر دامن میں دامن سے گر کر زمین پر

مفہوم: یہ ضرب المثل راز کے بارے میں ہے۔کوئی بات جب تک انسان کے دل میں ہے ایک راز کی حثیت رکھتی ہے۔

لیکن اگر ایک بار وہ بات زبان سے نکل جائے تو وہ بات راز نہیں رہتی اور نہ ہی کبھی واپس اسکتی ہے منہ سے نکلی

ہوئی بات ایک انسان سے دوسرے انسان ،دوسرے سے تیسرے اور اسی طرعوام الناس میں پھیل جاتی ہے۔(ص:۲۶۰)

پھیول رجیرجیدنہ پھسکدمرجید

وطن بھول بھی گئے تو کیا مگر وطن کی زبان کبھی نہ بھولنا

رنچن پوریگ اس ضرب المثل کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

قومی زبان کسی بھی قوم کی اولین پہچان ہوتی ہے۔انسان اپنے وطن میں رہتا ہو یا دنیا کے کسی بھی خطہ میں آباد ہو۔اس کی اصل پہچان کا ذریعہ اس کی قومی زبان ہی ہوتی ہے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اکثر لوگ اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے کسی دوسرے ملک میں مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔اور ایک دونسلوں کے بعد اپنے اصل وطن کو بالکل بھول جاتے ہیں۔یہ وہ فطری عمل ہے جس پر انسان زمانہ قدیم سے عمل پیرا ہے۔پوریگ کی اس ضرب المثل میں قومی زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان اپنے وطن کو بھول بُھی جائے مگر وطن کی زبان کو ہرگز نہ بھولے کیونکہ یہ زبان ہی ہے جو انسان کو نہ صرف اس کی اصل اور نسل کا پتہ بتاتی ہے بلکہ اس کے آبا واجداد اور ماضی سیمنسلک بھی رکھتی ہے۔(ص۳۳۴)

بوٹو(میدان)رتھنگ لم چک درول بنہ ایتو یونگس

یعنی، بوٹو کو بہت طویل راستہ چلنے کے بعد کام کی بات یاد آئی

مفہوم۔لداخ اور پورگ میں بوٹو نبدے کو کہتے ہیں۔اس ضرب المثل میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر بات یا کام کو اس کے صحیح وقت پر کرنا ہی مناسب ہوتا ہے ایسی بات یا کام کا اثر اور نتیجہ بھی حسب منشاء حاصل ہوتا ہے۔لیکن اگر کوئی بات یا کام اس کا صحیح موقع محل اور وقت گزرنے کے بعد کیا جائے تو وہ بے اثر ہوتا ہے اور اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہوتی۔(ص۲۶۱)

سناپی رجیس لہ ژوکپئے لم

پہلے قدموں کے نشان بعد والوں کے لئے راستہ بتاتے ہر مثبت اور اچھا کام بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل

راہ ثابت ہوتا ہے۔ جہاں ایک طرف تو بہت سے انسان اس اچھے کام سے استفادہ حاصل کرتے ہیں وہیں کچھ لوگ اسی اچھے کام کی بنیاد پر اس میں مزید جدت پیدا کر کے اس کو اور زیادہ فائدہ مند بنا دیتے ہیں۔ موجودہ دور کی بے شمار ایجادات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ مثلاً کمپیوٹر، ریلوے انجن اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ (ص۲۶۲)

ژان پھروسو سے رانگ پھروملدن

شنگ کوسو سے زگوکھی ملدن

پرائے بچے کو کتنا ہی پیار سے پالیں مگر اپنی اولاد نہیں بن سکتا بھیڑیئے کو لاکھ پالیں مگر گھر کا کتا نہیں بن سکتا۔

انسان فطرت کے تقاضوں کے منافی کوئی کام نہیں کرسکتا۔ خدا نے اپنی ہر مخلوق کو منفرد فطری صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے مگر ان فطری عناصر کو تبدیل کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ (ص ۲۶۶)

ثھیر چک دوکپہ مشیس نہ

ثھیر گیا لانکسپہ پھوغید

ایک بار صحیح جگہ پر نہ بیٹھنے سے سو بار اٹھنا پڑتا ہے۔

یہ ضرب المثل آداب مجلس کے بارے میں ہے۔ کسی مجلس میں انسان کو اپنی عمر اور مرتبہ کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر بیٹھنا چاہئے کیونکہ اگر وہ ایک بار غلط جگہ پر بیٹھ جاتا ہے تو بعد میں آنے والے ہر بزرگ اور معتبر انسان کو جگہ دینے کے لئے اس کو بار بار اٹھ کر اپنی جگہ تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ (ص: ۲۶۷)

(نیند) نکید تنکس پی بونگبو لہ رژ وامتھوب

ترجمہ۔ سوئے ہوئے گدھے کو گھاس نہیں ملی۔

زندگی میں انسان کو اتنا ہی ملتا ہے۔ جتنی وہ جد جہد کرتا ہے۔ جو لوگ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تقدیر کے آسرے پر بیٹھے رہتے ہیں وہ زندگی میں کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ (ص: ۲۶۸)

بونگبو بی ھرنیگ سیر سکا نگسنہ دیو بیامہ سکا نگسنہ دیو

ترجمہ۔ گدھے کے کان میں سونا ڈالوتو وہی ریت ڈالوتو وہی

مفہوم:۔ کسی احمق اور بیوقوف انسان کے لئے کوئی اچھی نصیحت یا کوئی بری بات دونوں ایک جیسی ہوتی ہے اس پر ان دونوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ (ص:۲۷۱)

(رنچن پرگ ؛ پورگ سکد (PURIG SKAD) پرنٹ ایکس، کراچی، ۲۰۰۷)

ترنگ موے سنا جور

لو قپری مک جور

اچھے لوگ (سادہ لوح) بہرے اور برے لوگ (کج خصلت) اندھے۔

صادق ہرداسؔی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔ اس تخلیق میں بظاہر بروں کا اندھا کہنا مناسب ہے۔ مگر اچھوں کو بہرا کہنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن تجربہ کار داناؤں نے جن اصل مشاہدات اور حقائق کی بنیاد پر اچھے لوگوں کو بہروں اور برے لوگوں کو اندھوں سے تشبیہ دی ہے اس میں ایک بڑی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ ضرب المثل تخلیق کرنے والے در اصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اچھے لوگ ہر واقعہ اور ہر سنی ہوئی بات کو اچھائی پر محمول کرتے ہیں۔ یہاں بہرے سے مراد اچھی اور صحیح باتوں کے سننے کے سلسلے میں ہے کہ اچھے لوگ در اصل بہرے بن جاتے ہیں۔ یعنی فتنہ وفساد برپا کرنے کے لیے منافق لوگوں کی پہنچائی ہوئی اور سکھائی جانے والی باتوں کے معاملے میں بہروں کی طرح بن جاتے ہیں اور ایسی فتنہ انگیز باتوں پر کان نہیں دھرتے جبکہ اس کے برعکس برے لوگ کج رو، اور دل کے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ فتنہ وفساد ان کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں یہ لوگ امن وآشتی نہیں چاہتے۔ اس لیے اصلاح احوال کے لیے سازگار ماحول دیکھنے کے باوجود اور حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی خیانت کرتے ہوئے سراسر انکار کرتے ہیں۔ گویا یہ لوگ اندھے ہیں جس طرح اندھا کچھ بھی نہیں دیکھتا اسی طرح یہ خیانت کار لوگ بھی اصلاح احوال کے لیے کچھ نہیں دیکھتے۔ مختصر یہ کہ اچھے لوگ غلط باتوں کو بھی ٹال جاتے ہیں اور برے لوگ اچھی باتوں سے بھی نظریں چراتے ہیں۔ ضرب المثل

میں ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ گونگے، بہرے لوگ فطرتاً نیک ہوتے ہیں۔ جہاں وہ خارجی نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں، وہاں یہ معذور لوگ باہر کی دنیا کی آلائشوں سے بھی پاک رہتے ہیں۔

غزوربہ دوگسے لق ہرنس

لفظی ترجمہ: درانتی کی موجودگی میں ہاتھ سے کاٹنا کیا معنی؟

تشریح:۔غزوربہ جسے اردو میں درانتی کہتے ہیں ایک قوس نما آلہ ہوتا ہے جس سے کسان گھاس اور فصلوں کی کٹائی کرتے ہیں۔ بظاہر جملے کا لفظی ترجمہ یہی ہے کہ درانتی کے ہوتے ہوئے ہاتھ سے گھاس کاٹنا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن ضرب المثل کا اطلاق معاشرتی زندگی کے سینکڑوں پہلوں پر ہوتا ہے۔مثلاً باپ کے ہوتے ہوئے اگر بیٹا نجی زندگی میں اپنے طور پر یک طرفہ فیصلہ کرے یا باپ کو نظر انداز کر کے گھر کا نظام چلانے کی کوشش کرے تو ایسے موقع پر یہ ضرب المثل بولی جاتی ہے۔مختصراً یہ کہ ذمے دار فرد کے ہوتے ہوئے غیر ذمے دار افراد کو اس کے فرائض اپنے ذمے لے کر خود کو پریشانیوں اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہیے۔(۱۵۶)ا

(ا۔حسنی، غلام حسن؛ ''تم لوٗ'' شبیر پرنٹنگ پریس نیا بازار، سکردو ، ۲۰۰۴)

رگیالفو موریا نگ موے زگوا۔

لفظی ترجمہ:۔بادشاہ بیوہ کے دروازے پر۔

تشریح:۔اس ضرب المثل میں انسانی ضرورت کو مجبوری قرار دیا ہے۔مثلاً ایک بادشاہ کے پاس دنیا کے ہر سہولت موجود ہے۔اس کے دیوان خانے میں زندگی کی تقریباً تمام مسرتوں اور خوشیوں کے سامان موجود ہیں۔اس کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ضرورت مند نہیں۔کسی وقت بھی وہ بادشاہ ضرورت اور کسی احتیاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک غریب سے غریب آدمی کے دروازے پر پہنچ سکتا ہے۔مثلاً ایک بادشاہ زندگی بھر لذت کام و دہن سیسے کام لیتا رہا۔انواع واقسام کے کھانے کھاتا رہا۔فرض کریں کہ ایک دن اس کے دل میں معمولی اور سادہ غذا کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اس مرحلے پر معمولی اور سادہ غذا ایک غریب کے دسترخوان کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتی ہے۔بادشاہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے کسی غریب آدمی کے دروازے پر دستک دے گا۔صدیوں کی یہ حکمت آمیز باتیں آج کے دور پر بھی منطبق ہوئی ہیں۔مثلاً الیکشن کے دنوں میں امیدوار یہ نہیں دیکھتا کہ فلاں آدمی غریب ہے۔وہ ووٹ لینے کے لئے امیر کے پاس بھی جاتا ہے اور غریب کے سامنے بھی دامن پھیلاتا ہے۔اس ضرب المثل میں انسان کے لئے جو نصیحت کی گئی ہے وہ یہ ہے

کہ اگر کوئی آدمی خوشحال ہے۔اس کے پاس دنیا کی ہر آسائش اور سہولت موجود ہے۔اس کے باوجود اسے دوسرے انسانو ں کو کمتر اور حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔زعم وغرور سے دامن بچانا چاہئے۔آج اگر وہ سونے کے جوتے پہن کر زمین پر اکڑ کر چلتا ہے تو کل کو ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ اسے ننگے پیر بھی چلنا پڑے۔غرض انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔مل جل کر رہنا اس کی فطرت میں شامل ہے وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے۔خصوصاً ایک ہی معاشرے میں، ایک ہی محلے میں رہتے ہوئے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم کسی دوسرے کا احسان نہیں اٹھائیں گے ہم اور آپ کو اپنے غریب سے غریب ہمسائے کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

مے کھیر بہ اونگ مہ

لفظی ترجمہ:۔آگ لینے آنا

مفہوم:۔جب کوئی شخص آکر فوراً چلا جائے یا کوئی دوست آئے اور آتے ہی جانے کا ارادہ ظاہر کرے تو اس موقع پر بولتے ہیں۔

پس منظر:۔پہلے وقتوں میں جب بلتستان بھر میں بطور ایندھن صرف لکڑی جلائی جاتی تھی اور ماچس کا استعمال بھی نہ تھا، چقماق استعمال کرتے تھے۔ایسے میں چولہے میں آگ کو باقی رکھنے کے لئے گھر کی مالک ایک موٹی لکڑی انگاروں کے درمیان رکھ کر اوپر راکھ لپیٹ کر سو جاتی تھی۔رات بھر چولہے میں جلنے کا عمل جاری رہتا اور صبح کے وقت جن گھروں کے چولہوں میں آگ نہیں ہوتی ان گھروں کی خواتین ہمسایوں کے گھروں سے آگ لے کر واپس اپنے گھر جاتیں۔اس عمل سے محاورہ تخلیق کرنے والوں نے یہ مقصد لیا کہ جو شخص کسی کے پاس آکر ٹھہرے بغیر یا مختصر وقت میں جلدی واپس جاتا ہے۔وہ اس محاورے پر صادق آتا ہے۔جملہ یوں ہوگا۔کیا تم آگ لینے آئے تھے کہ اتنی جلدی واپس جا رہے ہو۔(ص۱۰۳)

مے پھوا نہ سے ژھگس

لفظی ترجمہ:۔جب آگ جلائی جائے تو زمین کا کچھ حصہ بھی ضرور جلتا ہے۔

تشریح:۔جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس میں قدرے پریشانی اور مشکلات کا سامنا بھی ہوتا ہے۔خطرہ مول لینے سے کبھی کبھار نقصان سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔اس محاورے میں یہ پیغام پنہاں ہے کہ انسان کو وقتی سود وزیاں کی پرواہ

کئے بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کام کا آغاز کرنا چاہئے۔انسان جب کسی کام کوشروع کرتا ہےتو اس میں مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔ضرب المثل تخلیق کرنے والے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کامیابی اور ناکامی،نقصان اور فائدہ یہ سب زندگی کا حصہ ہیں۔اس تصور کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں۔آگ جلانے سے زمین کا ایک حصہ بھی جلتا ہے۔آگ جلانا استعارہ ہے۔کام کرنے کا،اس ضرب المثل کا بنیادی مقصد اعلیٰ مقاصد کے لئے بڑے اقدام کرنے والے کوایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کرنے کی تلقین کرنا ہے۔عام طور پر شادی کی رسومات نبھانے کے حوالے سے یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ آگ جلانے کے سبب کچھ نہ کچھ خرچ ہوہی جاتا ہے۔(۹۵)

جنمی سنودنا ھلچقسی منگل

لفظی ترجمہ: غیروں کا مال،لوہے کا رخسار

اردو میں مفہوم: مال مفت دل بے رحم،دوسروں کا مال بے دریغ استعمال کرنا۔

کام کاج کے موقع پر عاریتاً ایک دوسرے سے اوزار یا دوسری چیزیں عاریتاً لینا بلتستان کی عمرانی زندگی کی ایک روایت رہی ہے بالخصوص کھیتی باڑی کے موسم میں ایک دوسرے سے اوزار اور دیگر سامان عارضی طور پر مانگنے کا رواج آج بھی دور دراز علاقوں میں موجود ہے۔اسی حوالے سے اس محاورے میں ایک نکتہ اُٹھایا گیا ہے نکتہ ہے''دوسروں کے مال کو بے دردی کے ساتھ استعمال کرنا''مثلاً ایک آدمی کسی سے کام لیتا ہے اور اس چیز کو خراب کر کے واپس کر دیتا ہے۔ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے''غیروں کا مال لوہے کا رخسار''لوہے کے رخسار پر لاکھ طمانچے ماریں اس پر کیا اثر ہوگا اور پھر چیز بھی اپنی نہیں۔فطرتاً انسان اپنی چیز کو زیادہ عزیز رکھتا ہے کہ یہ محفوظ رہے۔لیکن وہ کسی دوسرے کی چیز کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے وہ چیز لوہے کی بنی ہوئی ہو حالانکہ بے احتیاطی سے استعمال کرنے پر لوہے کی چیز بھی خراب ہوسکتی ہے۔بلتی میں بیشتر ضرب الامثال لوگ غلط پڑھتے ہیں جملے کی گہرائی میں نہیں جھانکتے دراصل یہ ضرب الامثال''جنمی زان ہلچقسی منگل ہے''اگر چہ جملہ دونوں صورتوں میں مفہوم دیتا ہے تاہم ثانی الذکر جملہ زیادہ حقیقت اور مشاہدے کے قریب ہے۔غیروں کا کھانا لوہے کے جبڑے یعنی دوسروں کے کھانے کھاتے ہوئے آدمی تھکتا نہیں بلکہ وہ اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے جیسے اس کے جبڑے لوہے کے بنے ہوئے ہوں۔لوہے کا قدرتی رنگ چونکہ سیاہ ہوتا ہے اس لئے شاید داناؤں نے لوہے کے رخسار یا جبڑے کو بے شرمی سے تعبیر کیا ہے۔

زیرے میدنہ بزنگمہ لہ مکوس ، زیرے میدنہ بزنگپہ لہ مکوس

لفظی ترجمہ: جب تک مدعا بیان نہ کیا جائے نیک خصلت انسان بھی اصل مقصد سمجھنے سے قاصر ہے۔

تشریح:۔آرزو یا تمنا کا اظہار ضروری ہے۔ بے طلب چیز نہیں ملتی۔کسی کے سامنے اپنا مدعا بیان کرنے پر ہی دوسری جانب سے اس کا جواب ملتا ہے۔ضرب المثل میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنا مافی الضمیر بیان کئے بغیر دوسرا آدمی کچھ سن نہیں سکتا۔مطلب یہ کہ جب تک آپ کسی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کریں گے۔اس وقت تک دوسرے آدمی کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں بہت سے لوگ دل کی بات زبان پر لانے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔اور دل کی بات دل میں ہی رکھتے ہیں۔ان میں جراءت اظہار نہیں ہوتی۔اس خوبصورت جملے میں جراءت اظہار کی ترغیب دی گئی۔''بزانگمہ'' بلتی زبان میں اس اعلیٰ خاندان کے نیک خصلت افراد کے لئیا ستعمال ہوتا ہے۔جن کی سرشت اور خمیر میں سوائے جذبہ خیر وفلاح اور ارادہ صلاح کے کسی قسم کی بدنیتی اور بد طینیتی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ انسانوں کی بہتری کے خواہاں ہوتے ہیں۔اگر چہ اس طرح کے نیک خصلت انسان لوگوں کے مطالبے اور اظہار تمنا کے بغیر ہی ان کی تمام ضروریات کی برآوری کے لئے کوشاں ہوتے ہیں تاہم انسان ہونے کے ناطے کچھ خواہشات اور آرزوئیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے ہے۔جب تک لوگ واضح طور اپنا مدعا بیان نہ کریں وہ بھی کچھ نہیں دے سکتے۔چنانچہ اظہار مدعا لازم ہوتا ہے۔یہاں ہر انسان کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ مسائل کے حل اور خوہشات کی تکمیل کے لئے صرف آرزوئیں دل میں لئے رہنا کافی نہیں بلکہ واضح طور پر ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تک آپ مدعا بیان نہیں کریں گے سخی بھی آپ کو کچھ نہیں دے گا۔(ص۱۷۲)

سٹینگ یودنہ یکھ یود ،سٹینگ میدنہ <u>یمننگ</u> مید

لفظی ترجمہ: ہمت ہے تو کامیابی یہیں ہے، ہمت نہیں تو کامیابی یمن میں بھی نہیں

ترجمہ: اگر دل میں عزم وہمت ہے تو منزل قریب ہے یعنی حصول منزل کے لئے مصمم ارادہ، عزم وہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی پہلے ہی قدم پر دل ہارنے کا عادی ہے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔اگر مہم جوئی کے لئے عزم وہمت، قوت فیصلہ اور صلاحیتیں یکجا نہیں تو نشان منزل یمن میں بھی کیوں نہ ہو وہاں تک رسائی ممکن نہیں غالباً ملک یمن کا اشارہ دوری اور مسافت کے حوالے سے دیا گیا ہے۔اس فن پارے میں بہادری

اور بزدلی کے حوالے سے بات کہی گئی ہے۔ کہ اگر حوصلہ اور دل میں پختہ ارادہ ہے تو آپ کی خواہش اور آرزو کی تکمیل کا مرحلہ آپ کے لئے آسان ہے۔ اور اگر آپ میں ہمت نہیں تو کامیابی کی منزل بہت دور ہے۔ (ص ۱۷۴)

می تم لہ چھیس نہ رنگ تم چھو

لفظی ترجمہ:۔ لوگوں کی باتوں میں آؤ گے تو حقیقی بات بھی ضائع ہو جائے گی۔

مفہوم:۔ ہر ایرے غیرے آدمی کی بات سنو گے تو اصل مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔

تشریح:۔ اس ضرب المثل میں ہمارے معاشرہ کی ایک بڑی خامی کا ذکر ہے، وہ خامی یہ کہ ہر کوئی کسی کام یا معاملے کے بارے میں مفت مشورے دیتا رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کو مشورے دینے کی عادت ہوتی ہے۔ جبکہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کے مشورے پر عمل نہ کریں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مشورے صرف اسی سے لینا چاہئے جو متعلقہ معاملے میں ماہر ہو۔ اور مشورے اس وقت دینا چاہئے جب کوئی مشورہ طلب کرے۔ طرح طرح کے مشوروں پر عمل کرنے کے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ملتا۔ اس ضرب المثل میں اسی کا ذکر ہے۔ یہ ضرب المثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی غلط مشورے پر عمل کر کے نقصان سے دوچار ہو جائے یعنی لوگوں کی غلط باتوں کو اہمیت دی جائے تو سچی اور حقیقی باتیں ضائع ہوتے دیر نہیں لگتی۔ (ص ۲۹۸)

چھوس۔ زانگس۔ چک۔ بسنگ
سیمس زانگس۔ چک۔ رگیل

It is better to have a noble intention , then to have a noble faith.All religion preaches noble thoughts and noble intentions.Therefore ,noble thougts and noble means that it is intentions are seem to be the essence of the teaching of all religions. it better to have noble thoughts than to merely follow any religion.(p 216)

بال رسکرا۔ چک۔ گلبہ۔ بال رسکرا۔ گیاء۔ لنگس

when one hair was shaken, hundred hairs stood up.

It means examplary unity among a group of person or association.It also means that the suffering of one person moves others.(p213)

چوکھون نہ ہیق کھون

the malice of a ruler and a yak do not expose their enemities.

راجہ کی عداوت اور یاک کی عداوت دیرپا ہوتی ہے۔فوراً ظاہر نہیں ہوتی بلکہ یہ دونوں کسی پر بھی اپنا بدلہ لیکر ہی رہتے ہیں۔حکمرانوں کو اگر کوئی غریب حق بات بھی کہے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔یہ لوگ بات دل میں رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔حکمران احساس برتری اور اپنی بڑائی کو پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔عام آدمی کی ایک بات بھی برداشت کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔(پ۔۳۱۳)

اندپہ۔چک لہ۔سمن پہ۔رگیا

Hundreds Doctors for one patient.

It means large difference of opinion about one subject or matter.Different people provide different opinion.It used on an occasion when there is no consensus on an issue.

لونکا۔گنگ نا۔ہیوہیو

When the stomach is full then people sing

Hunger is a curse for all living creatures.Life does not sustain with out food.So when the stomach is full ,then people express their happiness and even sing and dance.So no one can expect a person to be happy when he is hungry.In old days there was abject poverty in this region so people always used to run after food.(p208)

انے لہ۔سنگ تم۔مہ زیر

Don't reveal your secret before a woman.

Women folk generally can not keep secrets into their bosoms.In a blow of their emotional out burst they disclose the secrets of others told to them.therefore the saying cautions us not to reveal our secrets before any woman though she may be very close to us.(p207)

رنگ ۔لس لہ۔چھو۔مہ سکومس

One does not feel thristy by doing one's own work.

Every body does his own work with great interest and enthusiasm. He does not feel hungery and thirsty while doing his own work.While doing the work of somebody else he will stop many times for drinking and eating something. (p201)

ننگ می نا۔زنکس نا۔ننگ ہلتو۔تھنگ لہ

When near one fights then the secret will come out.

Acquaintance and near one knows all the secrets.When they fight with each other then the people come to know all the secret of that house.(p 195)

زن ۔ ہرکون ۔سونگ نا۔نق سترن ۔توب

پین رہرمول ۔ ہرکون ۔سونگ نا۔رگونمہ ۔سوس

In the time of famine one must grow even black peas in the fields,

In time of scarcity of money one must rear a mare.

Nagstran is a large pea sown in Ladakh region.Though it is not the staple food having not a good taste yet it is yield is very good.In time of famine life can easily sustain on it. Similarly riding horses were a prized commodity in the region in old days as the only mode of transportation and communication. So by rearing a mare one could raise foals or colts which would bring a good price.

ہور۔ ہرتا۔شی ننگ ۔ہوریل ۔گو

A Yarqandi horse turns its head towards Yarqand at the time of dying.

Yarqandi horses were supposed to be very famous in Ladakh.It is said that the country of yarqand have large areas of grass lands and the animals thrive upon these grasses.Therefore the yarqandi horses were never fully adoptedin Ladakh

as they never got abundance of fodder in Ladakh.So they always yearned for their native land.It also means that the country of one's brith is very dear to every body.Even animals also exhibit the love for its brith place.It also means extream patriotisim.(p178)

بولون پہ۔رت لہ۔لق می۔ہیا نگ لہ

The loanee is on the plane but the guarantor falls from the precipice.

It means that to be a guarantor is not as easy as one think.Because the loanee goes scot free while the guarantor becomes responsible for thepayment of the loan. (p175)

تُھل پی۔تھک نہ۔کنگمہ۔ہر کیونگ

Strech your legs according to your blanket.

It means that one must see his own capacity before embarking upon a task.It also means to know one's own limit.(p174)

جھر بہ لہ۔چی رگوسیت سگ۔نس

What is the desire of a blind person -two eyes.

Every person has his own wishes and desire.He is not concerned with the desires and wishes of others.Just like a blind person longes for two sight similarly every person is concerned with his own desire and wishes.(p174)

تھق رنگس۔سی۔سپنگ۔سنونپو

A pasture at a distant seems more green.

It mean that anything which is inaccesible seems more attractive or an object seen from a distance seems more beautiful but when obtained it loses its charm.(p168)

رگا کھن لہ۔ژھیر کھہ۔می رگا کھن لہ۔ہلتن مو

A cause of concren to one's foes.

It means to say something or do such an action which may make ones friends worry and unhappy, and the same action may make one's enemy happy.(p157)

بلا۔میدپی۔ننگ۔نگ۔پی ژے۔ہلنگس

A house without a cat is the play ground for the mouses.

This saying is used when the head of the country or a family becomes very weak. in such case unscruplous people raise their heads and destory the peace and tranquility of the country .Similarly a weak head of the family may not be able to keep the affair of the family in control and run the day today affairs of the family smoothly.(p177)

سنینگ لہ۔ژھیر کھہ۔میدنا

مگ لہ۔مک چھو۔مید

(یعنی بےفکر ہو کے رہنا)

سہ کب ردوا کب بیا

عجلت میں ناقص کام کرنا

زراعت کے حوالے سے یہ محاورہ بنایا گیا ہے۔جب کاشت کار بددلی یا عجلت میں اچھی طرح کاشت نہیں کرتا اور بس پتھریلی زمین میں صرف پتھروں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اچھی زمین میں صرف دانے پر ہلکی سی مٹی ڈالنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔یہاں نصیحت یہ کی گئی ہے کہ ہر کام محنت سے کرنا چاہئے۔وقتی طور پر کندھا ہلکا کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ایسے کام ہمیشہ بےنتیجہ ہوتے ہیں۔(پ۱۰۸)

بونوے بونا بلی بو

ترجمہ:بیٹی کی اولاد اور بلی کے بچے ایک جیسے ہیں۔

تشریح:بزرگوں کو یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ بڑھاپے میں چھوٹے ان کا خیال نہیں رکھتے ان کے مشاہدے کے

مطابق نواسے، نواسیوں کی نسبت پوتے اور پوتیاں ان کی دیکھ بھال بہتر انداز میں کرتی ہیں۔یعنی بیٹی کی اولاد کو بلی کیبچوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔روایت ہے کہ جانوروں میں بلی وفادار نہیں ہوتی دودھ پی کرمنہ صاف کیا اور دور جا کر دم ہلانے لگی۔جبکہ کتے کو جانوروں میں وفادار شمار کیا جاتا ہے۔اس ضرب المثل میں بیٹی کی اولاد کو بلی کے بچوں سے تشبیہ دی گئی ہے تو یہ کوئی تعجب والی بات بھی نہیں بیٹی باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہے تو شادی کے بعد اس کی اولاد بھی نانا، نانی سے قربت نہیں رکھتی۔ فاصلے بڑھتے ہیں۔دوریاں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں ۔یہ بات سچ بھی ہے اور روزمرہ کا مشاہدہ بھی۔(ص۴۶)

چندے کھرا چھمس نہ کھے کھرا سا چھمسہ

ترجمہ۔جیب کی مٹھاس ختم ہوگئی تو کیا منہ کی مٹھاس بھی ختم ہوگئی

مفہوم۔اچھا انسانی اخلاق امیری یا غریبی سے مشروط نہیں ہوتا۔اس ضرب المثل میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر آپ کسی غریب ضرورت مند کی مالی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اس سے اچھے طریقے سے بات تو کر سکتے ہیں تا کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔(رنچن پر یگ، پر یگ سکد، ص: ۲۸۴)

سلام علیکم زیر بناغنڈ ویود پا

سوال کچھ کرنا جواب کچھ

سکن چن۔لہ۔زوا۔ہلچن تے

اماں۔لہ۔بو۔ہلچن تے

the born are not cumbersome for the ibex.

the child is not cumbersome for the mother (p94)

ہرتہ شی سے بونگبولہ راحت

ترجمہ: گھوڑا مر گیا تو گدھے کا راج

تشریح: باپ کے مرنے کے بعد اولاد گلچھڑے اڑائے اور عیش کرے تو یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ قابل، باصلاحیت اور باکردار انسان کے بعد جب اختیار نااہل افراد کے ہاتھوں میں آتا ہے تو وہ مال و دولت کو بے دریغ استعمال کرنے لگتے ہیں اور عہدہ ومنصب سے غلط فائدہ حاصل کرنا شروع کرتے ہیں مثال کے طور پر جب قابل باپ یا بھائی کی وفات ہوتی ہے تو نااہل بیٹے اور بے وقوف بھائی ان کی دولت کو پانی کی طرح بہاتے ہیں اور معاشرے میں اس طرح اپنا مقام بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (ص۔۶۷)

اوکپالہ نیالہ متھونگ نہ نمی چی قصور

ترجمہ: الودن کو نہ دیکھ سکے تو سورج کا کیا قصور۔

تشریح: الو یہ شکایت کرے کہ مجھے دن کو کچھ نظر نہیں آتا تو یہ کمزوری اور غلطی سورج کی نہیں۔ سورج تو پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے الو خود دن کی روشنی میں نہیں دیکھ سکتا۔ مطلب یہ کی جس انسان میں بصیرت نہیں وہ حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا۔ حقیقت سورج کی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ (ص۶۶)

آدم تھد فی کھہ، بیول ژھنگ درنگ فی کھ

ترجمہ: انسان کی اصل زندگی زندہ دلی میں مضمر ہے۔ جبکہ حیوان کی زندگی کا مقصد صرف پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔

تشریح: ۔خوشی انسان کے لئے ایک روحانی غذا ہے جبکہ غم انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ زیر بحث ضرب المثل میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ آدمی کو ہر حال میں خوش رہنا چاہئے۔ وہ اس لئے کہ زندگی کا راز خوشی ومسرت میں مضمر ہے۔ جبکہ جانوروں میں یہ فطری عمل نہیں وہ صرف جبلت کے تحت بس کھاتے پیتے ہیں لہذا جانوروں کی زندگی شکم پوری تک محدود ہے جبکہ انسانی زندگی خوشیوں سے عبارت ہے۔ (۵۰)

همت نہ روزی عمل نہ رونگ کھنگ

ترجمہ: رزق ہمت کے مطابق ملتا ہے اور عاقبت عمل کے حوالے سے بنتی ہے۔

مفہوم: برکت حرکت کے مطابق، عاقبت عمل کے مطابق۔ (ص ۳۴۹)

حاکمی دون لامہ سونگ ہرتانانی گیپلا مہ سونگ

حاکم کے سامنے اور گھوڑے کے پیچھے نہ جانا۔ (ص۔۴۹۲)

عمومی طور پر اگر دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلتی ضرب المثل پر اردو کے اثرات کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ ضرب المثل کا تعلق کسی مخصوص علاقے کی بولی یا زبان اور وہاں کے تجربات اور مشاہدات پر ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر محاورے اور ضرب الامثال بلتی زبان میں ہی ہیں۔

یوں تو بلتی زبان میں ہزاروں ضرب الامثال ہیں۔ ضرب المثل جو کہ اجتماعی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتی ہے اور ہر ضرب المثل کی اپنی الگ تاریخ ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ لداخ وبلتستان میں مغل اور ڈوگرہ راج کے دوران اردو اور فارسی سلطنت کی درباری زبان رہی۔ لہذا اس دور میں جو ضرب الامثال بنیں ان میں اردو فارسی کے الفاظ بھی شامل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ یہ ضرب المثل:

''حکمت / ہمت نہ روزی عمل نہ رونگ کھنگ''۔

لداخ اور بلتستان کے لوگوں کی زبان میں حکمت / ہمت، روزی، عمل جیسے الفاظ شامل نہیں تھے۔ زمانے کے حالات بدلنے سے زبان میں بھی تبدیلی آئی اور نت نئے الفاظ یہاں کی زبان میں شامل ہوگئے۔ مذکورہ مثال میں پیش کردہ الفاظ اسی طرح در آئے ہیں۔ آج کل لداخ ریاست جموں و کشمیر کا حصہ ہے اور ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ادھر بلتستان، حکومت پاکستان کے زیر نگرانی میں ہے اور اردو وہاں کی قومی زبان ہے۔ لہذا اردو زبان کے اثرات دونوں خطوں کی زبان اور وہاں کے ادب پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ماخذ۔

۱۔ حسنی، غلام حسن؛ تم لو (بلتی ضرب الامثال) شبیر پرنٹنگ پریس، سکردو بلتستان، ۲۰۰۴ء

۲۔غاسنگی، فدا حسین، ولایت علی، بلتی گرائمر اور بول چال، سودے بکس لنک روڈ، سکردو، ۲۰۱۱

۳۔فریدون آن کاچو اسفندیار خان؛Ancient Wisdem (بلتی ضرب الامثال پر مشتمل)، کاچو پبلشرز، کرگل (لداخ) جموں وکشمیر، ۲۰۱۴

۴۔رنچن پورگ ؛ پورگ سکد (PURIG SKAD) پرنٹ ایکس، کراچی، ۲۰۰۷

☆☆☆

حاصل مطالعہ

حاصل مطالعہ

اردو زبان ایک جامع اور شیریں زبان ہے۔ برصغیر کے علاوہ دنیا کے مختلف مما لک میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔اس زبان کی ایک خاص تاریخ اور روایت رہی ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اسے اول اور ثانوی درجہ کی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اسے قومی اور دفتری زبان کے حیثیت حاصل ہے۔

اردو زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیریت نے دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا۔لہذ ا اردو زبان کے اثرات مختلف زبانوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ان میں بلتی زبان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یوں تو بلتی زبان اور اردو زبان کا کوئی ریشہ ایک نہیں، بلکہ ان کا ریشہ یا مصدر الگ الگ ہے۔اردو کا تعلق ہند آریائی زبان سے ہے اور بلتی زبان کا سائنو تبتین زبان سے ہے۔سیاسی وسماجی تغیر کے ساتھ اس کے اثرات زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جب بلتستان اور لداخ میں ڈوگرہ راج نافذ ہوا تو انہوں نے اردو کو دفتری زبان کا درجہ دے کر اسے وقار و اعتبار عطا کیا۔

حسرتؔ صاحب کے بقول:۔

''بلتی زبان کا اردو کے لسانی خاندان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہاں کے لوگ دنیا سے منقطع ہونے کے باعث چھ سو سال تک ہند آریائی، ہند ایرانی اور عربی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔بلتی پر اردو کا اثر بلا واسطہ اور بالواسطہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۴۰ء کے بعد بلتستان جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ کے زیر تسلط آیا۔مہاراجہ کو بلتستان میں نظم ونسق چلانے کے لیے ملازمین کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت بلتستان کے ناخواندہ معاشرے سے فوراً پوری کرنا محال تھا۔اس کے لیے کشمیر، جموں اور شمالی ہند سے ملازمین لانے پڑے جہاں تعلیم مقابلتاً پہلے ہی عام ہو چکی تھی اور ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ چنانچہ بلتستان میں جب اسکول کھلے اور لوگوں نے آہستہ آہستہ تعلیم کی جانب توجہ دینا شروع کیا تو ذریعہ تعلیم اردو ہی کو قرار دیا گیا جو لوگ تعلیم حاصل کر لیتے وہ مہاراجہ سرکار کے ملازم ہو جاتے۔اس طرح اردو خود بخود بلتستان کی سرکاری زبان بنتی چلی گئی'' (بلتستان تہذیب وثقافت بلتستان بک ڈپو، نیا بازار سکردو ۲۰۰۷ء) جدید ایڈیشن ص، ۷۹۔)

بلتی زبان کی لسانی شاخ سائنو تبتین سے ملتی ہے۔بلتی زبان ہندوستان اور پاکستان کے کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اس زبان کو بلتستان کے رہنے والوں کی زبان کی مناسبت سے بلتی زبان کہلاتی ہے۔ یوں تو یہ زبان لداخ اور بلتستان دونوں علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔لداخ اور بلتستان میں بلتی زبان کے علاوہ شینا، پرگی اور لداخی، وغیرہ بھی بولی جاتی ہے لیکن شینا زبان کی شاخ بلتی سے نہیں ملتی ہے بلکہ اس زبان کا تعلق ہند آریائی زبانوں کی شاخ سے ملتی ہے۔لیکن بلتی، پرگی اور لداخی تینوں زبانوں کا تعلق سائنو تبتین سے ملتی اس حوالے سے عبدالغنی شیخ نے معروف محقق سنیو گتا

کوشل حوالہ دے کر لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''بول چال لداخی کا ماخذ تبّتی زبان ہے اور یہ چینی خاندان کی زبانوں کے چین تبت گروپ سے تعلق رکھتی ہے''۔۱

شیخ صاحب مزید لکھتے ہیں: ڈاکٹر سنیو گتا کوشل نے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے زیر اہتمام ۱۹۷۰ء کی دہائی میں قبائلی اور سرحدی علاقوں کی زبانیں سیکھنے کے پروگرام کے تحت عام بول چال کی لداخی زبان پر ریسرچ کیا اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ تاہم کئی یورپی محققوں کا خیال ہے کہ بول چال کی لداخی تبّتی زبان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہ اس خطے میں تبتیوں کی آمد سے بہت پہلے مروج تھی۔۲

جب لداخی بول چال کی زبان کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو اس کا اطلاق بلتی پر بھی ہوتا ہے۔ بلتی، لداخی اور پورگی کا رسم الخط پہلے ایک ہی تھا لیکن بلتی (پورگی) نے لگ بھگ پانچ سو سال پہلے اسے ترک کر دیا اس کی جگہ فارسی یا اردو رسم الخط اختیار کیا گیا اور اسی رسم الخط میں ہزاروں کتابیں اور بیاضیں لکھی گئیں۔

پرانے رسم الخط کو ایک تبّتی عالم تھونمی سمبھوٹا نے ساتویں صدی میں سنسکرت دیوناگری رسم الخط سے اخذ کیا تھا۔ انہوں نے تبّتی ماحول اور زبان کے مزاج اور ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم کی اور نئے حروف کو بھی اس میں شامل کیا۔ تھونمی سمبھوٹا کو تبت کے حکمران رونگ ژنگیاپو (۶۱۷۔۶۵۰) نے ایک ٹیم کے ہمراہ تبّتی زبان کے لئے ایک رسم الخط کی تلاش میں ہندوستان بھیجا تھا۔

بلتی اور لداخی ایک زبان ہونے کے باوجود بھی گزشتہ صدیوں کے دوران ان میں تغیر و تبدل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ساتویں صدی کے درمیان دونوں حصے تبت کے زیر نگرانی تھے تب دونوں خطوں میں تبّتی دیوناگری رسم الخط مروج تھا جسے ایگے کہا جاتا ہے۔

چودھویں صدی میں جید عالم دین میر سید علی ہمدانی بلتستان اور لداخ میں وارد ہوئے اور انہوں نے اسلام کا پیغام لوگوں تک عام کیا۔ ان کے بعد کئی مبلغین آئے جو اپنے ساتھ عربی اور فارسی زبانیں لائے۔ سولہویں صدی میں ایک بلتی شہزادی گل خاتون کی شادی مغل شہزادہ ولی عہد جہانگیر سے ہوئی۔ مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اس لیے براہِ راست فارسی اور عربی کا اثر بلتی زبان پر پڑا اور بلتی میں فارسی اور عربی کے متعدد الفاظ داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ بلتیوں نے فارسی رسم الخط کو اختیار کر لیا۔

۱،۲۔ شیخ، عبدالغنی؛ لداخ: تہذیب و ثقافت، کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، ۲۶۷، جوگی گیٹ، جموں (۱۸۰۰۰۱) ۲۰۰۵ء، ص: ۳۱۷

۱۸۳۶ء میں جموں کی ڈوگرہ حکومت نے لداخ کو اور ۱۸۴۰ء میں بلتستان کو اپنے زیر قبضہ لے لیا۔ ڈوگروں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو ریاست جموں کی سرکاری زبان بنادی اور پھر بعد میں اسے ذریعہ تعلیم بھی بنایا گیا۔ سرکاری زبان بننے سے پہلے بھی اردو بلتستان اور لداخ میں تبادلہ خیال کے لئے رابطے کی زبان تھی۔ فارسی ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود بھی اس کا استعمال اعلیٰ طبقہ تک محدود تھا۔ آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق عام لوگوں کے لئے دفاتر میں اردو اور انگریزی کا استعمال ہوتا تھا اس کی وجہ سے اردو کو سرکاری زبان بننے میں آسانی ہوئی۔ بلتی کی طرح لداخی میں بھی فارسی اور اردو کے متعدد الفاظ اپنی اصلی یا بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ لداخی میں گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران اردو، فارسی اور انگریزی الفاظ کی جگہ متبادل الفاظ اور اصطلاحات نے لے لی ہیں جن کا ماخذ تبتی ہے۔ تبتی الفاظ لداخی زبان میں بڑی آسانی سے گھل مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لداخی زبان میں موجود الفاظ کے استعمال کی مہم بھی چلائی گئی۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ یہ نتیجہ نکلا کہ حالیہ سالوں میں لداخی زبان دانوں اور دانشوروں نے لداخی زبان کو غیر لداخی الفاظ سے پاک کرنے کے لئے قدرے غلو سے کام لیا۔ حتیٰ کہ ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی فون اور فلموں میں بھی اس کے الفاظ اور جدید سائنسی ایجادات کے لئے متبادل لداخی الفاظ وضع کئے گئے۔ گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران لداخی میں اردو، فارسی اور عربی سمیت کئی اور زبانوں کے الفاظ اصلی یا بگڑی صورت میں مدغم ہوئے ہیں۔ جن کو عام لوگ روزمرہ کی بات چیت میں استعمال کرتے ہیں۔ تاہم عمومی طور پر اکثر لوگ لداخی زبان استعمال کرنے لگے ہیں۔ جس کو سماجی طور پر قبولیت حاصل ہوئی ہے جو بلتیوں کے لئے اجنبی بنی ہے۔ اس کے برعکس بلتی بولنے والے اپنی تحریر، تقریر اور روزمرہ کی بات چیت میں فارسی، عربی اور اردو کے الفاظ بے کم و کاست استعمال کرتے ہیں۔ جو پچھلی کئی صدیوں کے دوران بتدریج بلتی زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ بلتی مورخ اور ادیب محمد یوسف حسین آبادی لکھتے ہیں:

''صدیوں سے بلتی زبان کے لئے فارسی رسم الخط رائج ہونے کی وجہ سے بلتی ادب کا سارا ذخیرہ اس رسم الخط میں موجود ہے اور اس سے دامن چھڑانا بلتی کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔۲

ایک اور بلتی مصنف راجا محمد علی شاہ صباؔ نے اپنی تاریخی کتاب، نقیب آزادی،، میں لکھتے ہیں:

'بلتستان میں طلوع اسلام کے بعد عربی اور فارسی کے اثرات اس قدر تیزی سے نفوذ پذیر ہوئے کہ تبتی زبان 'ایگے'

۱۔ حسرتؔ، محمد حسن؛ بلتستان تہذیب وثقافت، جدید ایڈیشن، بلتستان بک ڈپو، نیا بازار سکردو، ۲۰۰۷ء، ص:۹۷

۲۔ آبادی، محمد یوسف حسین؛ تاریخ بلتستان بلتستان بکڈپو نیا بازار، سکردو، ۲۰۰۳، ص:۳۲۱

ایک دم متروک ہوگئی۔''۔ا

عام بلتیوں کے مزاج اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلتی کے لئے اردو یا فارسی رسم الخط قائم ودائم رہے گا۔اگر چہ بلتستان کی راجدھانی سکردو اور کرگل میں چند دانشور بلتی ادیبوں کی خواہش ہے کہ پرانے رسم الخط کو بحال کیا جائے۔بلتی پرانے ایگے (رسم الخط) میں صوتی لحاظ سے چند ایسے حروف ہیں جن کے متبادل حروف اردو یا فارسی میں نہیں ہیں۔اس سلسلے میں اردو کے چند حروف تہجی پر اعراب ڈال کر متبادل حروف وضع کئے گئے ہیں جو صوتی کمی کو پورا کرتے ہیں۔اس کا سہرا محمد یوسف حسین آبادی کے سر ہے۔انہوں نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں ادبی تنظیم حلقہ علم وادب سکردو کی میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی تھی جو معمولی ترمیم کے ساتھ منظور کی گئی بعد میں اسے قاعدہ کی صورت میں یہ شائع کیا گیا۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راجا محمد علی شاہ صباء نے لکھا ہے:

''چونکہ فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی بلتی زبان صحیح تلفظ کے ساتھ ممکن نہ تھی۔اس لئے بلتستان کے حلقہ علم و ادب جو قابل حد تحسین و آفرینش ہے،، کی ایما پر بلتستان کے مشہور دانشور اور ماہر تعلیم جناب محمد یوسف حسین آبادی کی زیر نگرانی چند اہل قلم حضرات نے بلتی زبان کے لئے حسب ضرورت چند حروف وضع کئے جس کی وجہ سے اب بلتی تحریروں کو اصلی تلفظ اور آوازوں کے ساتھ پڑھنا ممکن اور آسان ہوگیا ہے۔''۲

بلتی زبان میں پچاس حروف ہیں جن میں ۴۳ حروف مفرد اور ۷ حروف مرکب ہیں۔جموں وکشمیر کی حکومت نے بلتی اور لداخی زبانوں کو ریاست کی منظور شدہ زبانوں کے شیڈول میں شامل کیا ہے اور لیہہ اور کرگل قصبوں میں کلچرا کادمی کے دفاتر کھولے گئے ہیں اور ریاستی سرکار ہر سال بلتی اور لداخی زبان کی بہترین کتابوں کو ایوارڈ دیتی ہے۔بلتی تصنیف اردو رسم الخط میں قبول کی جاتی ہے۔جموں وکشمیر میں کشمیری، گوجری اور پہاڑی زبانوں کا رسم الخط بھی اردو ہے۔

اگر ہم ان دونوں زبانوں کا تجزیہ اور مطالعہ کریں تو ماہرین لسانیات میں یہ متفقہ رائے ہے کہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی زبان ہے۔پرگی سے مراد کرگل اور اسکے گردونواح میں بولی جانے والی زبان،اور بلتی سے مراد کرگل (لداخ) و بلتستان میں مروج و مستعمل زبان ہے لیکن ان دونوں زبانوں میں اتنی مماثلت ہے کہ یہ دونوں زبانیں کافی حد تک ایک جیسی لگتی ہیں۔صادق علی صادقؔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ہر ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ بلتی اور پرگی زبان کا نہ صرف چولی دامن کا رشتہ ہے بلکہ اکثر مقامات پر یہ پہچاننا

ا۔صباؔ، راجہ محمد علی شاہ اماچا؛ نقیب آزادی۔گیلانی پرنٹرز رابسن روڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۲۳۱

۲۔صباؔ، راجہ محمد علی شاہ اماچا؛ نقیب آزادی۔گیلانی پرنٹرز رابسن روڈ، کراچی، ص:۲۳۲

مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا یہ زبان بلتی ہے یا پرگی۔ بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جہاں سے بلتی زبان کا لشکر اپنی آپ وتاب کے ساتھ روانہ ہوجاتا ہے۔ وہاں سے ہی پرگی زبان کا کارواں اس میں مدغم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ بلتی بولنے والا پرگی اور پرگی بولنے والا بلتی با آسانی بول اور سمجھ سکتا ہے۔ بلتی اور پرگی کے ذخیرہ الفاظ، جملوں کی ساخت، لہجے، تلمیحات اور اشارات، طرز بیان اور فکر و احساسات مشترک ہیں بشرطیکہ لوگ پرگی کے الفاظ اور ان کے مخارج کو صحیح اور قدیم ڈھنگ سے استعمال کرے۔

بلتستان اور پریگ کے لوک روایات، لوک گیت، قصے کہانیاں، اور تہذیب وتمدن خواہ اشاعتِ اسلام سے پہلے کی ہو یا بعد کی سب کے سب مشترک ہیں،،ا۔

بلتی کا ادبی سفر باقاعدگی سے ۱۸۴۰ء میں شروع ہوتا ہے۔ بلتی زبان نے متعدد شعرا پیدا کئے ہیں۔ ماضی میں بلتستان میں سرکردہ فارسی شعراء بھی گزرے ہیں جن میں میر نجم الدین ثاقب کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہیں۔ فی زمانہ بہت سارے شعراء اردو اور بلتی دونوں زبانوں میں اپنا کلام لکھتے ہیں۔ چند بلتی شعراء اپنی اردو شاعری کی رعنائی اور غنائیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ شعر گوئی عام لوگوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ بلتستاں کے آخری راجا احمد شاہ کے چار بیٹے حسین علی خان محبؔ، لطف علی خان عاشقؔ، امیر حیدر مخلصؔ اور ملک حیدر بیدلؔ اچھے شاعر تھے۔ بقول ایک نقاد کہ انہوں نے ڈوگرہ حکومت کی قید و بند کے دوران غزل گوئی، قصیدہ گوئی، مرثیہ گوئی اور نوحہ خوانی کو عروج کمال تک پہنچایا۔ عاشق کے بیٹے محمد علی خان ذاکر نے بھی قصیدے اور مرثیے لکھے ہیں۔ شگر کے بلتی راجا حیدر خان حیدر اور ان کے بیٹے مراد خان مراد بھی شاعر تھے۔ مراد نے فارسی اور اردو میں بھی طبع ازمائی کی ہے حیدر کے کلام میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کے اشارات ہیں۔

بلتی میں قرآن مجید اور انجیل کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع کے دوران ایک انگریز اے ایف سی ریڈ نے انگریزی میں بلتی زبان کی میں ترجمہ ہوا۔ بلتی اور لداخی میں بہت سی ضرب الامثال ہیں جن کا اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ فارسی۔ بلتی، اردو۔ بلتی اور انگریزی۔ بلتی لغات بھی چھپی ہیں۔ سید حسین موسوی امبہ کی مجمع لغات اور شیخ علی حلمی کی لغت ھدا یۃ الطالب اطلی اللغہ اس ضمن میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

بلتستان کے مقابلے میں لداخ میں بلتی زبان میں لکھنے والے بہت کم ملتے ہیں لداخ میں سب سے پہلے بلتی زبان میں لکھنے والوں میں، ضلع کرگل سے تعلق رکھنے والے آخوند محمد کاظم سنگرہ ہیں آخوند صاحب نے مراثی، نوحے اور قصیدے لکھے ہیں

ا۔ جالبؔ، جواد امینی؛ مدحت، امینی پبلی کیشنز، ڈیتھنگ کرگل، جنوری ۲۰۱۵، ص:۳۲

۔اس کے بعد شیخ غلام فیاض نے نعت ومنقبت میں طبع آزمائی کی اس کے علاوہ اور بھی شعراء اور نثر نگار ہیں جن کا تذکر اس مختصر سے خاکے میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بلتی زبان میں بھی ادب کا آغاز شاعری سے ہی شروع ہوا ہے اس لئے بلتی میں نثری ادب کم اور شعری سرمایہ وافر مقدار میں دستیاب ہے۔شاعری بہت زیادہ ہیں۔وہ کتابیں جو نثر میں موجود ہیں ان میں اکثر کتابیں مذہبی نوعیت کی ہیں۔آنے والے دنوں میں نثری ادب میں بھی اضافہ ہونے کا امکان ہے۔بلتی ایک جامع زبان ہے جس کا شعری سرمایہ بہت بڑا ہے۔بلتی میں حمد،نعت،منقبت،قصیدہ،مرثیہ،مناجات،نوحہ،مثنوی،رباعی ،قطعہ،شہر آشوب،گیت،غزل،ہجو،ملی نغمہ،قوالی اور زرعی نغمہ لکھا گیا ہے۔اوزان ،قوافی اور ردیف کا خیال رکھا جاتا ہے۔تشبیہ،استعارہ،کنایہ،رمز وغیرہ بلتی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔محمد یوسف حسین آبادی بلتی شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں:

''ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے بلتی قصیدے،مرثیے،نوحے،ہجو عموماً اردو غزل کی صورت میں ہوتے ہیں۔جن کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے۔ہیئت اور ساخت کے علاوہ معنویت کے اعتبار سے بھی بلتی شاعری انتہائی ترقی کے منازل طے کر چکی ہے۔جس میں فصاحت و بلاغت کے سارے اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔''۱

بلتی ادیب صبا نے بھی لکھا ہے کہ بلتی زبان میں بے نظیر شہپارے اور لاجواب منظومات موجود ہیں۔سید محمد کاظمی نے متعدد بلتی لوک گیتوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ''بلتی لوک گیت'' کے نام سے کتاب شائع کی ہے۔سینو گتا کوشل نے لداخی زبان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہ اپنی جگہ ایک مکمل زبان ہے۔اس میں تحقیق کی اُپج اور صلاحیت ہے۔ہر قسم کا ادب اس میں تخلیق ہوسکتا ہے اور کسی دوسری زبان کے سہارے کی اسے ضرورت نہیں ہے''۔۲

دو اور لداخی زبان کے غیر لداخی سکالر ڈاکٹر روینہ اگروال اور ہیلسن نانورنج کا بھی یہی خیال ہے کہ لداخی ایک جامع زبان ہے۔دونوں خواتین لداخی زبان جانتی ہیں۔بلتی پر بھی ان کی اس اراء کا اطلاق ہوتا ہے۔تاریخ ادبیات بلتستان کے مصنف محمد حسن حسرتؔ رقم طراز ہیں:

''بلتی زبان لوک ادب کے اعتبار سے مالا مال ہے۳

---

(۱)۔تاریخ بلتستان بلتستان، ص:۳۳۷

(۲)۔لداخ:تہذیب وثقافت،ص:۳۱۷ (۳)۔تاریخ ادبیات بلتستان،ص:۱۶

بلتی ادب میں لوک کہانیاں ،داستانوں ،لوک گیتوں ، پہیلیوں ،لوریوں ،کہاوتوں ،روایتوں اور ضرب الامثال کا وافر ذخیرہ موجود ہیں۔

بلتی اور لداخی ادب میں کیسر کی طویل رزمیہ داستان بڑی مشہور ہے۔اس کا جرمنی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔بلتی اور لداخی ایک ہی زبان ہے تاہم زبان دانوں کا یہ ماننا ہے کہ بلتی تلفظ لداخی کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔بلتی زبان میں ترجمے کا کام بھی ہوا ہے۔محمد یوسف حسین آبادی کے علاوہ شیخ جعفری نے ۱۳۸۹ میں قرآن مجید کا ترجمہ بلتی میں کیا ،شاہ عباس نے متی کی انجیل مقدس کا ترجمہ ''کھوم لوکھسی لم'' کے نام سے اور صحیفہ مہدیہ عربی کا ترجمہ سید مرتضٰی شیگری نے ۱۹۸۸ میں بلتی میں کیا ہے جبکہ صحیفہ سجادیہ کا بھی بلتی ترجمہ ہوا ہے۔محمد صادق ہرداسی نے اپنے ایک حالیہ مضمون 'بلتی زبان کی ابتداء تاریخ اور موجودہ صورت حال' میں لکھا ہے۔بلتی زبان میں افسانوں کے کئی مجموعوں کے علاوہ اسٹیج اور ریڈیائی ڈرامے پچھلی کئی دہایئوں میں منظر عام پر آئے ہیں۔نیز ریڈیو البموں کے علاوہ ضلع کرگل میں جدید بلتی غزلوں کے تقریباً دس البم مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔لیہہ اور کرگل کے علاوہ ریاست اتراکھنڈ کے کئی شہروں میں آباد ادب نواز بلتی ،بلتی زبان وادب کی ترقی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔لداخ کے علاوہ بلتستان جو آبادی کے لحاظ سے اور زبان وادب کے لحاظ سے زرخیز ہے۔یہاں بھی بلتی زبان وادب کی خاطر خواہ خدمت ہو رہی ہے اور بلتی زبان میں چاہے نظم ہو یا نثر روز بہ روز ترقی کی جانب گامزن ہے۔

اس مقالے میں موضوع کی مناسبت سے مختلف ابواب قائم کئے گئے ہیں۔باب اول: مختصر تاریخ لداخ وبلتستان، باب دوم: بلتی زبان کی ابتداء اور ارتقاء' باب سوم: خطہ لداخ وبلتستان کی زبان پر اردو کے اثرات' باب چہارم: بلتی زبان کے معروف شعراء کی تخلیقات اور ان پر اردو کے اثرات، باب پنجم: (حصہ اول) بلتی زبان کے معروف نثر نگاروں کی تخلیقات اور ان پر اردو کے اثرات، (حصہ دوم) بلتی کہاوتوں پر اردو کے اثرات۔

المختصر یہ کہ راقم الحروف نے اس موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کر کے اسے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے ۔جہاں تک بلتی زبان پر اردو کے اثرات کو اگر دیکھا جائے تو اردو زبان کی ہی دین ہے کہ بلتی میں قصیدہ، مرثیہ، غزل، شہر آشوب، بحر طویل، داستان، افسانہ جیسی مختلف اصناف ملتی ہیں۔ورنہ پہلے محض نظم یا غزل کا ہی غلبہ تھا۔نعت کو خدا پی لہو، منقبت کو امام پی لہو، کہا جاتا تھا۔اردو، فارسی کی دین ہے کہ ہر صنف سخن کو الگ الگ درجہ کی حیثیت سے جانا اور پہچانا گیا۔اصناف سخن کے علاوہ اردو کے بہت سے الفاظ بلتی زبان میں شامل ہونے لگے جو مقامی زبان کے الفاظ تھے وہ متروک ہو گئے لیکن خاص وعام کو سمجھنے میں دقت اور دشواری نہیں ہوتی۔اب تو اردو الفاظ کو ملائے بغیر بات میں روانی بھی

پیدا نہیں ہوتی۔ گویا براہ راست نہیں بلا واسطہ طور پر اردو کے اثرات بلتی زبان وادب پر ثبت ہوئے ہیں۔

آخر میں میں اپنی بات کو خطہ لداخ کے نامور شاعر وادیب جناب عبدالحمید تنویر صاحب کی اس بات پر ختم کرتا ہوں۔ وہ بلتی زبان پر اردو کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

جب دو زبانیں اکٹھے چلتی ہیں تو ایک دوسرے پر ایک دوسرے کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ اسی طرح اردو زبان کا اثر بلتی زبان پر بھی پڑا ہے۔

ا۔ اب بلتی زبان میں بہت سے الفاظ اردو کے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اثر، سفر، داغ، نظر، حقیقت، وجہ۔ ایسے بہت سے الفاظ بلتی زبان میں استعمال ہوتے ہیں جن سے ان الفاظوں کا بلتی لفظ بالکل ختم ہو چکا ہو۔

۲۔ جب سے اردو رائج ہوئی تب ہر ایک چیز جیسے بے نامہ، رسید، اقرار نامہ وغیرہ لوکل زبان میں لکھا جاتا تھا اور تبت یعنی بدایگ اسکرپٹ استعمال ہوتی تھی۔ اور اسے پرانی یعنی آبا واجداد کی اسکرپٹ کہا جاتا تھا۔ اب یہ رسم الخط بالکل پرک یا بلتستان میں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اب قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ بلتی زبان میں کہے جاتے ہیں وہ بھی اب لکھنا ہو تو اردو رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ آجکل کے نوجوان بچے اور بچیاں گھر میں اردو زبان بولتے ہیں اور اسکولوں میں بھی استاد بلتی زبان کے بجائے اردو زبان استعمال کرتے ہیں۔ جس سے بلتی زبان کو بڑا دھچکا لگا ہے۔

۴۔ ریڈیو ٹیلی ویژن میں بھی زیادہ اردو یا دوسرے زبانوں میں پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جس سے بھی بلتی پر کافی اثر پڑا ہے۔

۵۔ آجکل سائنس اور ٹیکنولوجی کے دور میں ایسے ایسے الفاظ آتے ہیں جس کی اصطلاح یا الفاظ بلتی زبان میں نہیں ملتی ہے۔ اس لئے ایسے الفاظ اردو یا انگریزی کا ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔

لیکن آجکل ریڈیو اسٹیشن اور کلچرل اکادمی کی بدولت بلتی زبان کو بھی دوسری علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ فروغ مل رہا ہے اور آجکل کے نوجوان شعراء بلتی زبان میں شاعری کرنے لگے ہیں اور فیچیر وغیرہ بھی بلتی زبان میں لکھا جاتا ہے۔

حکومت ان زبانوں کی ترقی اور عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور ان پر اچھی خاصی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ان کوششوں سے بلتی زبان کی بھی شان وعظمت بحال ہوگی۔ اس میں عوام کا بھی تعاون ہونا ضروری ہے۔ (عبدالحمد تنویر)

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

آبادی، محمد یوسف حسین؛ قرآن مجید کا ترجمہ، بلتی زبان میں بلتستان پرنٹرز اینڈ پبلیشرز، سکردو، ۱۹۸۵ء

آبادی، محمد یوسف حسین؛ تاریخ بلتستان، بلتستان پرنٹرز اینڈ پبلیشرز، سکردو، ۲۰۰۳ء

آبادی، محمد یوسف حسین؛ بلتستان پر ایک نظر، بشیر پرنٹر، سکردو، ۱۹۸۴ء

آخون، احمد حسین ہرداس؛ گلشن منشور، خواجہ پریس بک، دہلی، ۱۹۹۵ء

آخوند، یوسف علی ہرداس؛ راہ نجات (نثری کتاب) کلاسک پرنٹر پریم نگر گئوشالہ روڈ، غازی آباد، ۱۹۸۸ء

آزاد، جان محمد؛ جموں وکشمیر میں اردو مصنفیں، انجمن معاون اسلام، کرگل (لداخ)، ۲۰۱۴ء

ارتضی کریم: مرتب (اردو صحافت کے دوسو سال، لداخ میں اردو صحافت، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) ۲۰۱۷، ص ۳۱۱۔

امبہ، سید حسین موسوی؛ نوائے حق (مجموعہ کلام)، حسینی الفلاح سوسائٹی اُمبہ کرگل، ۲۰۱۲ء

بابو، عبدالقیوم؛ لداخ پر ایک طائرانہ نظر، نشاط لائبریری لیہہ لداخ، ۲۰۰۸ء

بشارتؔ، آخوند اصغر علی؛ گل دستہ بشارت (مجموعہ کلام)، ایس این کمپیوٹر، دریا گنج دہلی، ۲۰۰۱ء

بشارتؔ، آخوند اصغر علی، محرق القلوب (مجموعہ کلام)، ایس ایس انٹر پرائز، کوچہ چیلاں دریا گنج دہلی

بشارتؔ، آخوند اصغر علی، بزم بشارت، ایف ایس انٹر پرائزز، دریا گنج دہلی، ۲۰۱۱ء

بھوانی، بھٹا چاریہ، ذکیہ مشہدی (مترجم)، لداخ کا سایہ، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۵ء

پریمی، برج۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ۱۹۹۲ء

تمنی، غلام رسول، لمگیر قس، یونیک پبلیشر سکردو، ۲۰۱۴ء

جالبؔ جوادامینی؛ خش ءِ سکیونژے (چراغ محبت) امینی پبلی کیشنز، ڈیتھنگ، کرگل، لداخ۔ ۲۰۱۵ء

جالبؔ، جوادامینی، مدحت، امینی پبلی کیشنز، ڈیتھنگ کرگل، جنوری ۲۰۱۵ء

جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کرگل (لداخ)؛ نتی ادب، (مجلّہ بہ زبان بلتی)، ۲۰۱۰ء

حامدی کشمیری؛ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، تاجران کتب گاؤ کدل چوک، سری نگر، ۲۰۱۰ء

حسرتؔ، محمد حسن؛ تاریخ ادبیات بلتستان، ٹی ایس پرنٹرز راولپنڈی، پاکستان، ۱۹۹۲ء

حسرتؔ، محمد حسن؛ پیامِ سحر (مجموعہ کلام شیخ غلام حسین سحرؔ بلتستان بک ڈپو، پبلیکیشنز نیا بازار، سکردو بلتستان، ۲۰۱۳
حسرتؔ، محمد حسن؛ جوہر بلتستان، سید محمود یونیک کمپوزنگ سنٹر سکردو، ۲۰۱۵ء
حسرتؔ، محمد حسن؛ پولو ایک ثقافتی کھیل۔
حسرت، محمد حسن؛ بلتستان تہذیب وثقافت، بلتستان بکڈ پوانیڈ پبلیکیشنز نیا بازار، سکردو، ۱۹۹۵ء
حسنی، غلام حسن؛ بلتی ضرب الامثال، شبیر پرنٹنگ پریس سکردو، بلتستان، ۲۰۰۴ء
حسنی، غلام حسن؛ سکردو سے کرگل تک، شبیر پرنٹنگ پریس، سکردو، ۲۰۰۹ء
خان، بسمل محمد علی؛ شالیمار سرینگر، ولی دارالکتابت، سری نگر
راہول سنکر واتسائن؛ میری لداخ یاترا، ۱۹۲۶ء
رقیہ بانو؛ لداخ میں اردو زبان وادب، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، ۲۰۱۴ء
رنچن پورگ؛ پورگ اسکد (PURIG SKAD)، پرنٹ ایکس، کراچی، ۲۰۰۷ء
زبدوی، شیخ، علی، لیہہ لداخ؛ مکاسب محرمہ، (نثری کتاب)
سحرؔ، شیخ غلام حسین؛ بیان سحر، یونیک کمپوزنگ سنٹر، سکردو، ۲۰۱۳ء
سروری، عبدالقادر؛ کشمیر میں اردو، کلچر اکیڈیمی سرینگر، ۱۹۸۲ء
سکندرؔ، کاچو اسکندر خان؛ قدیم لداخ، کپور برادرس بک سیلر، سرینگر، ۱۹۷۸
سکندرؔ، کاچو سکندر خان؛ افکار پریشان، کاچو پبلشرز، کرگل، جموں وکشمیر، ۲۰۰۱ء
سہروردی، غلام حسن، نوربخشی، تاریخ بلتستان۔ ویری ناگ، پبلشرز میر پور، آزاد کشمیر۔۱۹۹۲ء
شیگری، سید مرتضٰی؛ صحیفہ مہدیہ، عربی کا بلتی ترجمہ، میر فتاح پبلیشر، قم ایران، ربیع الاول ۱۳۲۸ھ
شیخ، عبدالغنی؛ لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، ۲۰۱۱ء
شیخ، عبدالغنی؛ لداخ: تہذیب وثقافت؛ کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، ۲۶۷، جوگی گیٹ، جموں (۱۸۰۰۰۱) ۲۰۰۵ء
شیخ، عبدالغنی؛ دنیا کے چند مشہور ترین ناول
شیخ، عبدالغنی؛ لداخ نامہ۔ ۲۰۰۰ء
شیخ، عبدالغنی، ماہنامہ آجکل، لداخی لوک گیت
شیخ، غلام حسین، کرکیت چھو؛ جواہر الافکار، ۱۹۶۶ء، تفہیم المسائل، ۸۶، ۱۹۸۵ء

شیرازہ؛(جموں،کشمیر،لداخ قدیم تزکروں اورسفرناموں کی روشنی میں)جلد:۴۹،کلچرا کادمی سرینگر، ۲۰۱۰ء

شیرازہ؛(جموں،کشمیر،لداخ قدیم تزکروں اورسفرناموں کی روشنی میں)جلد:۵۳،کلچرا کادمی سرینگر۔۲۰۱۵ء

شیرازہ؛(جموں،کشمیر،لداخ قدیم تزکروں اورسفرناموں کی روشنی میں)جلد:۴۵،کلچرا کادمی سرینگر

صادقؔ،علی صادق؛صدائے صادق(حصہ دوم،تاچہارم)،ایس ایس انٹر پرائزز،دریا گنج دہلی،۲۰۰۰ء

صباؔ،محمد علی شاہ؛ترجمہ وتشریح کلام باواعباس،سودے بک ڈیپوانیڈ پبلیشر،سکردو، ۲۰۰۴ء

صباؔ،محمد علی شاہ؛بلتی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۳ء

عبدالحکیم؛لداخی طنزیہ گیت

عبدالحمید؛لداخی،اردو،انگریزی لغت،منگولین پبلیکیشن،لیہہ لداخ، ۱۹۸۹ء

فریدونؔ،کاچواسفندیارخان؛داستان کربلا،(بلتی مرثیہ)نسرین فاطمہ،کاچوپبلشرز،کرگل(لداخ) ۲۰۰۵ء

فریدونؔ،کاچواسفندیارخان؛کلیمن(مجموعہ کلام)،کاچوپبلشرز،کرگل(لداخ)جموں وکشمیر، ۲۰۱۴ء

غاسنگی،فدا حسین؛بلتی گریمر،سودے بک ڈیپوانیڈ پبلیشر،سکردو، ۲۰۰۸ء

فریدونؔ،کاچواسفندیارخان؛Ancient Wisdem،کاچوپبلشرز،کرگل(لداخ)جموں وکشمیر، ۲۰۱۴

قرۃالعین؛جموں وکشمیر میں اردوزبان وادب کا مستقبل مشمولہ''آئینہ نما''،سرینگر، ۲۰۰۵ء

کاظمیؔ،سیدمحمد عباس؛بلتی لوک گیت،لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام اباد،پاکستان، ۱۹۸۸ء

کلچرا کادمی لیہہ لداخ؛لوک کہانیاں(پانچ جلدیں)،۱۹۸۰ء۔۲۰۰۰ء

گلدستہ عباس،ساقب پبلیشر لاہور، ۱۹۸۰ء

لکھنوی،مولوی،حشمت اللہ؛مختصر تاریخ جموں وکشمیر،جے،کے،بک ھاوس،ریذیڈنسی روڑ،جموں (توی)،۱۹۹۸ء

لوبسنگ،غلام حسن؛تاریخ بون فلسفہ۔اکبرکریم برچہ،ھونزہ پریٹنگ پریس گلگت۔ ۱۹۹۷ء

محمد جان ابن حسن۔کل گلشن ہزارزہرا(مجموعہ کلام)مکتبہ حسن کالسی گیٹ،اتراکھنڈ۔۲۰۱۳۔

محمد علی شاہ بلتستانی،بلتی اردو لغت،طاہر پرنٹنگ پریس اسلام آباد۔۲۰۰۳ء

محمد علی شاہ شگری۔نقیب آزادی۔۔گلانی پرنٹر رابسن روپ کراچی۔۱۹۹۸ء

محمد نذیر۔بلتستان ادب اور ثقافت۔۔سکردو۔۱۹۹۸ء

مظہرے، احمد حسین؛ صحیفہ مھدیہ، سجاد آباد، شگر، ربیع الاول ۱۴۲۷ھ،
مظہری، شیخ، احمد علی؛ دعائے کمیل، بلتی ترجمہ۔ مجمع جہانی اہلبیت ۔۱۴۳۵ھ
نتی ادب؛ سیکریٹری جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، کرگل لداخ،، ۲۰۱۰ء
نگارشات بلتستان۔ سودے بک ڈیپو اینڈ پبلیشر سکردو۔ ۲۰۰۵ء
والٹر اسبو، جوزف گیرگن۔ ایک ہزار لداخی کہاوتیں۔ جنرل آف دی ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ ۱۹۴۲ء
ہرداسی، محمد صادق۔ بلتی مہاجرین کی مختصر تاریخ۔ تقسیم ہند کے تناظر میں۔، اسلامیہ سکول چوک، کرگل، ۲۰۱۳ء

☆☆☆

Balti Zuban Wa Adb Par Urdu Ke Asraat:

Ek Tajziyati Mutala

Influences of Urdu on Balti Language and Literature:

An Analytical Study

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of

Doctor of philosophy

Submitted By

Wilayat Ali

Under the Supervision of

Prof.S.M Anwar Alam(Anwar Pasha)

Centre of Indian Languages (CIL)

School of Language, Literature &Culture Studies (SLL&CS)

Jawaharlal Nehru University

New Delhi.110067

2019